Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1972

لمعات

"بنگلہ دیش" اور صدر بھٹو

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

جلد (۲۵) اکتوبر ۱۹۷۲ء نمبر (۱۰)

فہرست

(۱) یہ ہندو ہے ——— ۲

(۲) لمعات ——— ۳

(۳) پنجاب کے مسائل ——— ۱۹

(۴) طلاق کے طریقۂ کار کی تشکیلِ نو ——— (محترم محمد رضا الرحیم) ——— ۲۹

(۵) حقائق و عبر (اب بلوچستان کی باری ہے، مطلع عرض ہے، ——— ۳۲
ہمارے پاس ثبوت موجود ہے، جناب شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی،
حیاتِ نو کا مکتب، نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا، جس کی چیز تھی اس کو دے دیا گیا،
یہ سب اسلام کے نام لیوا ہیں، نیا دینی نصاب، چرس اور سینہ زوری، نہایت آسان حل،
دیہی آزمودہ حربہ، ایک قابلِ اعتراض اصطلاح۔)

(۶) نقد و نظر ——— ۴۹

(۷) مجلسِ مذاکرہ (۲) (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء) ——— ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ، لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ...

یہ ہندو ہے

پاکستانی فوج کا سپاہی سید نعیر ایک زخمی کی حیثیت سے پانچ ماہ تک بھارت کی قید میں رہنے کے بعد حال ہی میں پاکستان واپس آیا ہے۔ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی رو سے بتایا ہے کہ:-

پاکستان کی فوجی قوت کو مفلوج کرنے کے لئے بھارت کے فوجی ڈاکٹروں نے بہانتک غیر انسانی کاروائیاں کیں کہ ہمارے بیشتر زخمی جنگی قیدیوں کی ہڈیاں غلط جوڑیں۔ بعض کے زخم خراب کئے اور انہیں اتنا عرصہ وہیں روکے رکھا کہ پاکستان میں ہڈیاں از سر نو جوڑنے اور خراب کئے ہوئے زخم ٹھیک کرنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ ہمارے جوانوں کی ٹانگوں اور بازوؤں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے سرے ملا کر جوڑنے کے بجائے ہڈی کے ٹوٹے ہوئے حصے اوپر تلے رکھ کر پٹیاں کس دی گئیں۔ یہ بدقسمت افسر اور جوان جب پاکستان آئے تو ہڈیاں مکمل طور پر بیکار ہو چکی تھیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کے متاثرہ اعضاء کاٹ دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ تمام افراد عمر بھر کے لئے معذور ہو گئے جن کی ہڈیاں جوڑی جا سکتی تھیں اور وہ فوج کے قابل رہتے۔ بعض کے زخم اس قدر خراب کر دیئے گئے تھے کہ پوری ٹانگ یا بازو کاٹنا پڑا۔ (حکایت۔ ستمبر ۱۹۷۲ء)

یہ ہندوؤں کے ڈاکٹروں کی ذہنیت اور روش ہے جنہیں دکھیا انسانیت کا غمخوار اور چارہ ساز سمجھا جاتا ہے!

---- (۰) ----

(۲)

جب صدر بھٹو مسز اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کے لئے جا رہے تھے تو ہم نے (طلوع اسلام بابت جولائی ۷۲ء میں) لکھا تھا کہ جانے کو تو وہ جائیں (کہ اس کے سوا چارہ نہیں) اور بھارت کے ساتھ معاہدات بھی کریں، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ نہ ہندو کی بات کا اعتبار کیا جا سکتا ہے نہ ان کے معاہدات پر اعتماد۔ جھوٹ بولنا ان کا دھرم ہے اور فریب دینا ان کا آدرش۔ اس لئے ان سے معاہدہ کر کے یا کوئی وعدہ لے کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا خود فریبی ہو گا۔

معاہدہ شملہ کی شق اول یہ تھی کہ طرفین کی جانب سے اس کی توثیق کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر مغربی محاذ سے فوجیں قبل از جنگ کی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی۔ اس کے لئے ۴ ستمبر کی تاریخ مقرر ہوئی۔ بھارت نے اسے بلطائف الحیل ۱۵ ستمبر تک بڑھایا لیکن تادم تحریر فوجیں وہیں کی وہیں بیٹھی ہیں۔ اب کبھی اندرا گاندھی یہ کہہ رہی ہیں کہ چونکہ پاکستان کے مسائل میں بعض بیرونی قوتیں مداخلت کر رہی ہیں اس لئے معاہدہ شملہ پر عملدرآمد کی راہ میں مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ کبھی وہاں کا وزیر خارجہ سورن سنگھ شکایت کرتا ہے کہ "بنگلہ دیش" کے تسلیم کرنے سے متعلق جو کچھ ان سے کہا گیا تھا، پاکستان اس کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس لئے معاہدہ شملہ پر عملدرآمد نہیں کیا جا رہا۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کی نئی کنٹرول لائن کے تعین کا کام بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

یہ ہے ہندو! یاد رکھیئے!! ہندو کا علاج ایک فیصلہ کن جنگ کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ (۱) پاکستان کے اندر کسی قسم کا انتشار اور اختلاف پیدا نہ ہو۔ اور (۲) ہم اپنی نژاد نو کو مسلسل و متواتر بتاتے رہیں کہ ہندو کیا ہے اور وہ ہمارے ساتھ کیا کچھ کرنے کے عزائم رکھتا ہے۔ اور اسے بھی یاد رکھیئے کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ ہندو کے ساتھ دوستی اور خوشگوار تعلقات کا راگ الاپتے رہیں گے۔ سمجھ رکھیئے کہ ایسا کرنے والے آج بھی پاکستان کے اسی طرح مخالف ہیں جس طرح اس زمانے میں تھے۔ (۲۱ ستمبر ۷۲ء)

---- (۰) ----

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو!

صدر بھٹو نے ۱۴ر اگست ۷۲ء کو جو تقریر مرکزی اسمبلی میں کی تھی اس کی حیثیت محض ایک اخباری خبر کی نہیں تھی جس کی عام عمر ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ تقریر ایک مملکت کے سربراہ کی تھی اور کی گئی تھی ایوانِ اسمبلی میں۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں متعدد نکات سامنے لائے گئے تھے لیکن بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی رُو سے (جسے عام طور پر لاہور ریزولیوشن کہا جاتا ہے) ایک آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا' یا شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو الگ الگ آزاد خود مختار مملکتوں (SOVEREIGN - STATES) کا مطالبہ۔ بالفاظِ دیگر کیا قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے نزدیک تقسیمِ ہند کا نتیجہ 'ہندوستان' اور پاکستان کی دو آزاد مملکتیں تھیں' یا ہندوستان کی ایک مملکت اور پاکستان کی دو آزاد مملکتیں تھیں۔ صدرِ مملکت نے فرمایا ہے کہ تحریکِ پاکستان کا مطلوب و مقصود شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو الگ الگ آزاد مملکتوں کا قیام تھا۔ قبل اس کے کہ ہم صدر بھٹو کی تقریر کا تجزیہ کریں اور ان کے اس نکتہ کا جائزہ لیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس نکتہ کے پیش کرنے سے ان کا مقصد کیا تھا۔

"بنگلہ دیش"

قارئین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جون میں جب صدر بھٹو مسز اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کے لئے ہندوستان جانے والے تھے تو پہلے مرکزی وزیر میر خورشید حسن صاحب نے" اور پھر شیخ حامد محمود صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی رُو سے دو آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا اس لئے ہمیں بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس پر ہم نے لکھا تھا کہ اگر ان حضرات کے اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ

(۱) مشرقی پاکستان کو شروع ہی سے ایک آزاد مملکت ہونا چاہیئے تھا۔

(۲) اسے اس کی اس حیثیت سے محروم رکھ کر بڑا ظلم کیا گیا۔

(۳) مجیب نے اگر اب اُسے آزاد کرا لیا ہے تو اس نے بنگالیوں کو ان کا وہ حق دلایا ہے جسے ان سے چوبیس سال تک غصب کیا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے مجیب نے جو کچھ کیا وہ بالکل جائز اور تقاضائے عدل و انصاف تھا۔

اور جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی وہ مجرم تھے۔

(۲) بھارت اور روس شکریہ کے مستحق قرار پانے چاہئیں کہ انہوں نے ایک حقدار کو اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد میں مدد کی۔ (ملاحظہ ہو 'طلوع اسلام' بابت جولائی ۱۹۷۲ء)

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو سامنے لانے سے مقصد یہ تھا کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے کے لئے ایک بنیادی دلیل مہیا کی جائے۔

صدر بھٹو نے گذشتہ اگست میں گلگت کا دورہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ۲۶ اگست کو ہنزہ میں اخباری نمائندگان سے بھی بات چیت کی تھی۔ اس بات چیت کے دوران ایک نامہ نگار نے سوال کیا کہ:-

> جس طریق سے ہندوستان اس کی تعبیر کرتا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے خیال کے مطابق آپ "بنگلہ دیش" کو اگست کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے پہلے تسلیم کرنے والے تھے لیکن اب نہیں ہوا۔

اس کے جواب میں صدر بھٹو نے فرمایا:-

> میرا ایسا ہی ارادہ تھا میں ایسا کرنا چاہتا تھا میں اب بھی اسی موقف پر قائم ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب سے شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان سے گیا ہے میں مسلسل کہہ رہا ہوں کہ یہ ضروری ہے کہ میں (بنگلہ دیش "تسلیم کرنے سے پہلے) اس سے مل لوں۔

اس کے بعد صدر بھٹو نے کہا کہ انہوں نے مجیب کو (لندن میں) ٹیلیفون کیا تھا اور اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ اس پر ایک نامہ نگار نے پوچھا کہ کیا مجیب نے آپ کو یہ جواب دیا تھا کہ چونکہ آپ نے اس کے ملک کو تسلیم نہیں کیا اس لئے وہ آپ کی طرف سے مایوس ہے۔ اس کے جواب میں صدر بھٹو نے فرمایا۔

> وہ یہی رٹ لگاتا رہا ___ "بنگلہ دیش" تسلیم کرو۔ "بنگلہ دیش" تسلیم کرو۔ اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ اصولی طور پر ہم نے اسے تسلیم کر ہی لیا ہے۔ کیا آپ نے میری وہ تقریر نہیں پڑھی جو میں نے (۱۴ اگست کو) اسمبلی میں کی تھی۔ اگر نہیں پڑھی تو اسے اب پڑھ لیجئے۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۔ ۲۷ اگست ۱۹۷۲ء)

مسئلہ کی اہمیت

اس سے واضح ہے کہ صدر بھٹو اپنی ۱۴ اگست کی تقریر سے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ہم نے "بنگلہ دیش" کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا ہوا ہے اور ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو اس کے لئے بطور دلیل پیش کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر (بتیس سال کے بعد) ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو پیش کرنے سے مقصد کیا ہے۔ یہی اس نکتہ کی اہمیت ہے جس کے پیش نظر ہم نے اس کا تجزیہ ضروری سمجھا ہے۔ اس تقریر میں صدر بھٹو نے فرمایا:-

> آیئے ہم ۱۹۴۰ء کی اصلی قرارداد کو دیکھیں۔ کیا وہ ریزولیوشن ایک مملکت کا مطالبہ کرنے کے لئے تھا یا دو آزاد مسلم مملکتوں کے لئے؟ قائد اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات صحیح صورت حال بیان کرتے ہیں (ان میں دو مملکتوں کا تصور دیا گیا تھا جن میں) کانفیڈریشن کے ذریعے باہمی رشتہ قائم کرنا مقصود تھا۔ اس کے چھ سال کے طویل عرصہ کے بعد ۱۹۴۶ء کی ترمیم منظور کی گئی تاکہ اس سے قریب تر ہوا جا سکے جسے

ہندو اور انگریز دینے کے لئے تیار تھا۔ اس طرح آخر الامر پاکستان کے دو جڑواں بچوں کی تولید ہوئی۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

ہمیں اس حقیقت کو بآسانی فراموش نہیں کر دینا چاہیئے کہ بنگال کے علیحدگی پسند اپنے مطالبہ کو بار بار و تکرار اسی بنیاد پر پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ مسٹر عطار الرحمٰن خان، مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن تک بھی، اپنے مطالبہ علیحدگی کی بنیاد اسی ریزولیوشن کو قرار دیتے رہے ہیں۔

صدر بھٹو نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ:

(۱) ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی رو سے دو الگ الگ آزاد مملکتوں کا وجود میں لانا مقصود تھا۔

(۲) قائداعظمؒ کے بیانات اور تقاریر اس کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ ان دونوں مملکتوں میں کنفیڈریشن کے ذریعے رشتہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔

(۳) ایک پاکستان کا تصور ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوا کیونکہ ہندو اور انگریز کچھ ایسا ہی چاہتے تھے۔

ہمیں نہایت افسوس ہی نہیں دلی رنج اور صدمہ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دعاوی تاریخی حقائق کے خلاف ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن

پہلے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو لیجئے۔ بات یوں ہوئی کہ ہندو اور انگریز چاہتا تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ماتحت پورے ہندوستان کو ایک مملکت اور وہاں کے باشندوں کو ایک قوم فرض (یا تسلیم) کر کے ہندوستان کے لئے ایک آئین مرتب کیا جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انگریز اور ہندو پر واضح کیا جائے کہ ان کا یہ منصوبہ مسلمانوں کے مطالبہ کے یکسر خلاف ہے اور اس قسم کا کوئی آئین ان کے (مسلمانوں کے) نزدیک قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لئے "آل انڈیا مسلم لیگ" کے سالانہ اجلاس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ ریزولیوشن پاس ہوا جسے بعد میں قراردادِ پاکستان یا لاہور ریزولیوشن کہہ کر پکارا گیا۔ اس ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ

مسلمانوں کے نزدیک کوئی آئینی پلان قابلِ قبول نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ ان اصولوں کے مطابق مرتب نہ کیا جائے کہ جغرافیائی اعتبار سے ملحق علاقوں کی نشاندہی کر کے انہیں اس طرح کے خطے بنا دیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے خطے انہیں باہم گر ملا کر آزاد مملکتیں بنا دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس ریزولیوشن میں نہ ایک مملکت کا ذکر ہے نہ دو کا۔ اس میں صرف یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان کا حصہ قرار نہ دیا جائے۔ انہیں ہندوستان سے الگ "آزاد" قرار دیا جائے۔ اور اس اعتبار سے نیا کانسٹی ٹیوشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شمال مغرب اور شمال مشرق کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے "قائداعظمؒ" یا مسلم لیگ کی مراد شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو الگ الگ آزاد مملکتیں تھیں یا ان دونوں کو ملا کر ایک مملکت۔

قائداعظمؒ کا تصور

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء سے لے کر ان کی وفات تک، قائداعظمؒ کی کسی تقریر، تحریر یا بیان میں دو مملکتوں کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس انہوں نے اسی زمانے میں اس کی وضاحت کر دی تھی — اور وہ اسے تقسیم ہند تک برابر دہراتے

سے ہے کہ اس سے مراد ایک مملکت ہے۔ لاہور ریزولیوشن ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس کے ایک سال بعد مسلم لیگ کا سالانہ

۱۹۴۱ء میں فرمایا

اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا۔
ہم نے اس امر کا تہیہ کر رکھا ہے — اور اس باب میں کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے کہ ہم نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے منوا کر رہیں گے۔ اور اس برصغیر میں ایک آزاد مملکت قائم کر کے چھوڑیں گے۔ (تقاریر جناح۔ شائع کردہ محمد اشرف جلد اول ص ۲۷۰)

یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ اب آگے چلئے ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی اور قائداعظمؒ کے مابین وہ خط و کتابت ہوئی جس نے

گاندھی جناح خط و کتابت

مسلم لیگ کے مؤقف اور مطالبہ کو نکھار اور ابھار کر رکھ دیا۔ خط و کتابت میں زیر بحث بنیادی سوال یہی تھا کہ

۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کا مفہوم کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ریزولیشن کا جو مفہوم اس خط و کتابت میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ مستند مفہوم اور کون سا ہو سکتا ہے؟ یہ خط و کتابت ستمبر ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی اور اسے نومبر ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سنٹرل آفس نے نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے وہی نسخہ ہے۔ یہ خط و کتابت اس قابل ہے کہ اسے بہ تمام و کمال سامنے لایا جائے لیکن ہم اس وقت صرف مسٹر گاندھی کا وہ متعین سوال جس کا تعلق ہمارے مسئلہ زیرِ نظر سے ہے، اور قائداعظمؒ کا جواب درج کرتے ہیں۔

مسٹر گاندھی:۔ کیا یہ دو خطے الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی؟

قائداعظمؒ:۔ نہیں! یہ مملکتِ پاکستان کے اجزاء (UNITS) ہونگے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قائداعظمؒ کے اس جواب کے بعد اس مسئلہ کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم قائداعظمؒ کی پیش کردہ دو ایک اور وضاحتیں بھی سامنے لاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں کہا تھا کہ ملک کی تقسیم کے بعد متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ

(۱) ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین ہوگا۔

(۲) ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے اس میں دو آزاد مملکتیں قائم کر دی جائیں — ایک ہندوستان دوسرا پاکستان۔

مسٹر گاندھی نے پوچھا تھا کہ تقسیم کے بعد بھی دفاع اور آمد و رفت کے دیگر معاملات ایسے رہ جائیں گے جن کا تعلق ہندوستان اور پاکستان سے مشترک طور پر ہوگا۔ ان کا تصفیہ کیسے ہوگا۔ قائداعظمؒ کا جواب تھا۔

جب ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی تو ان میں کسی مشترک معاملہ کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟

جب یہ مذاکرات ناکام رہ کر ٹوٹنے لگے تو مسٹر گاندھی نے قائداعظمؒ سے کہا تھا کہ آپ مجھے خواہ مخواہ مطعون کرتے ہیں کہ میں نے آپ کا کوئی مطالبہ نہیں مانا۔ آپ ذرا وضاحت تو کیجئے کہ میں نے آپ کا کون سا مطالبہ نہیں مانا؟ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے جن مطالبات کی وضاحت کی تھی ان میں بنیادی طور پر کہا گیا تھا کہ:-

آپ نے (مسٹر گاندھی نے) اسے بھی تسلیم نہیں کیا کہ لاہور ریزولیشن کی رُو سے پاکستان ان دو خطوں پر مشتمل ہوگا جن میں شمال مغرب میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبے ہونگے اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے صوبے۔

فرمائیے! اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد قائد اعظمؒ نے (۵ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو) ڈیلی ورکر لندن کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:۔

مطالبہ پاکستان کو پوری وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ چھ صوبے یعنی سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب، شمال مغرب میں اور بنگال اور آسام شمال مشرق میں۔ ان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ کے قریب ہے جو کل آبادی کا ستر فیصد ہے۔ باقی غیر مسلم ہیں۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان صوبوں پر مشتمل پاکستان کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم کیا جائے۔

یہ اکتوبر ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ قائد اعظم نے ۸ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا۔

جغرافیائی حیثیت سے پاکستان مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا، اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصہ ہونگے۔ (تقاریرِ جناحؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۲۵)

یہ نومبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان میں آیا۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ

۱۹۴۶ء کا کنونشن

میں یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مشن کے سامنے مسلمانوں کا مطالبہ نہایت متعین الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے قائد اعظمؒ نے ایک نہایت مدبرانہ قدم اٹھایا۔ اُس وقت انتخابات حال ہی میں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان انتخابات کے نتیجہ میں جو مسلمان اراکین لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے، وہی مسلمانوں کے صحیح اور مستند نمائندے تھے۔ قائد اعظمؒ نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ان تمام اراکین (جن کی تعداد پانسو سے زیادہ تھی) پر مشتمل ایک کنونشن (دہلی میں) منعقد کیا۔ اس کنونشن کا اجلاس ۸۔۹ر اپریل کو اینگلو عربک کالج کے میدان میں ہوا۔ اس میں (بنگال کے راہ نما) مسٹر سہروردی نے اپنی اس تقریر کے ساتھ جسے فی الحقیقت ایک ادبی شاہپارہ کہا جا سکتا ہے، وہ ریزولیشن پیش کیا جس میں پاکستان کی واحد آزاد مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا جو شمال مغرب میں، سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان۔ اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگی۔ اس کنونشن نے اس قرارداد کو منظور کیا۔ اگرچہ اس کنونشن کی حیثیت کچھ کم ذمہ دارانہ نہیں تھی لیکن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے وہیں اعلان کر دیا تھا کہ اس قرارداد کی توثیق مسلم لیگ کونسل سے بھی کرا لی جائے گی۔ چنانچہ اس کی توثیق مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس سے کرا لی گئی جو قائد اعظمؒ کی صدارت میں ۹ر جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔

اس ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد قائد اعظمؒ نے کیبنٹ پلان کے سلسلہ میں بیان دیتے ہوئے (۲۲ر مئی ۱۹۴۶ء کو) کہا:۔

مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان

مل کر ایک آزاد و خود مختار مملکت قرار پائینگے۔ (تقاریر جلد دوم۔ ص۳۹۰)

اور اسی کے مطابق ملک کی تقسیم ہوئی اور پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آگئی۔ دو جڑواں بچے نہیں، ایک ہی تنومند و توانا نونہال۔

واضح رہے کہ اس کنونشن میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن میں ایک مملکت کا تصور دیا گیا تھا یا دو مملکتوں کا۔ اس نکتہ کی شرح وبسط سے تشریح کی گئی تھی۔ اور آخر میں یہی قرار پایا تھا کہ (جیسا کہ قائداعظمؒ اس کی تشریح کرتے چلے آئے ہیں) اس ریزولیوشن میں بھی ایک ہی مملکت کا تصور دیا گیا تھا۔

اگر بفرض محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن میں دو مملکتوں کا تصور تھا اور اس کے بعد اس میں ترمیم کر کے ایک مملکت کا مطالبہ کیا گیا، تو سیاست کا ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی مطالبات حالات کے تابع بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی ارتقا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اصول تو غیر متبدل رہے لیکن اس کی جزئیات یا اصول کے طریق کار بہ تقاضائے حالات بدلتے رہیں جب اس اصول ارتقا کی رُو سے کسی پہلے فیصلہ کی جگہ دوسرا فیصلہ لے لے تو سند اس بعد کے فیصلہ کو حاصل ہو جاتی ہے۔ پہلا فیصلہ مستند نہیں رہتا۔ مسلمانانِ ہند کے سلسلہ میں اصولی فیصلہ یہ تھا کہ وہ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اور جداگانہ مملکت کے حقدار۔ اس اصول کے تابع اگر (بغرض دلیل) ۱۹۴۰ء میں دو مملکتوں کا فیصلہ کیا گیا تھا اور ۱۹۴۶ء میں ایک مملکت کا تو قابلِ سند ۱۹۴۶ء کا فیصلہ قرار پائے گا نہ کہ ۱۹۴۰ء کا۔ اگر کوئی شخص ۱۹۴۰ء کے فیصلہ پر اصرار کرتا ہے تو اس سے پوچھئے کہ وہ ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کو کیوں اعتبار کی قرار نہیں دیتا جب مسلم لیگ پہلے پہل وجود میں آئی تھی اور مطالبہ چند مراعات تک محدود تھا۔

صدر بھٹو نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ ہندو اور انگریز جو کچھ دینا چاہتا تھا وہ اس فیصلہ سے قریب تر تھا۔ یہ بات بھی تاریخی حقیقت کے خلاف ہے۔ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن آیا۔ اس کا پلان یہ تھا کہ ہندوستان کو تین منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے ــــ (۱) شمال مغرب میں مسلم اکثریتوں پر مشتمل منطقہ جسے گروپ (A) کہا گیا تھا۔ (۲) شمال مشرق میں مسلم اکثریتوں کا علاقہ جسے گروپ (B) کہہ کر پکارا گیا تھا۔ اور باقیماندہ ہندوستان جسے گروپ (C) کہا گیا تھا۔ ان تین گروپوں میں ایک فیڈریشن ہی قائم کر دی جائے۔ یہ نظام اوّلاً دس سال تک قائم رہے جس کے بعد ان گروپوں کو اختیار حاصل ہو کہ وہ چاہیں تو اس نظام میں شامل رہیں اور چاہے اس سے الگ ہو جائیں۔ چونکہ اس پلان میں پہلی بار مسلمان اکثریت کے علاقوں کو باقیماندہ ہندوستان سے الگ کرنے کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا اس لئے مسلم لیگ نے اس پر اتفاق کر لیا لیکن ہندو اس پر بھی راضی نہ ہوا اور انگریز نے بھی یہ نہ کیا کہ اپنے پلان کو یہ کہہ کر ملک میں نافذ کر دے کہ مسلمانوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مسلم لیگ نے اپنے کنونشن کے فیصلہ کو اپنا مطمحِ نگاہ قرار دے کر راست اقدام (DIRECT ACTION) کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو اس سمت میں پہلا قدم بھی اٹھا لیا گیا۔ اس سے انگریز اور ہندو مطالبہ پاکستان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ ہیں واقعات جن پر تاریخ شاہد ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا ۱۹۴۶ء میں انگریز اور ہندو اس پاکستان (یا اس کے قریب قریب کچھ) دینے پر آمادہ ہو گئے تھے جسے ہم نے ۱۹۴۷ء میں حاصل کیا یا وہ اس کی مخالفت کر رہے تھے!

اگر وہ اس پر رضامند ہو گئے تھے تو مسلم لیگ کو راست اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟

(۱)

بہرحال یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ تحریک پاکستان کے دوران تصور ایک ہی مملکت کا تھا اور اسی لئے قائداعظم شروع ہی سے ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کی یہی تعبیر پیش کرتے چلے آئے تھے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے!

لیکن اس دعویٰ کے اثبات کے لئے ہم بیرونی گواہوں تک محدود کیوں رہیں۔ کیوں نہ خود مدعی (مسٹر بھٹو) کو بطور گواہ پیش کر کے ان کی اپنی زبان سے بتائیں کہ ان کے نزدیک ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن کی صحیح تعبیر کیا ہے۔ ان سے زیادہ معتبر اور مستند گواہی اور کس کی ہو سکتی ہے؟

مسٹر بھٹو کی کتاب (THE GREAT TRAGEDY) جسے اردو میں "عظیم المیہ" کا نام دیا گیا ہے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ خود انہی کے پیش لفظ کے ساتھ اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے صفحہ اول پر مسٹر بھٹو آغاز سخن ان الفاظ سے کرتے ہیں:۔

ہمارا نقطۂ آغاز ۱۹۴۰ء ہے جب ۲۳ مارچ کو مسلمانان ہند نے قائداعظمؒ کے زیر قیادت، پاکستان کا مطالبہ کیا ــ یعنی برصغیر میں ایک الگ آزاد مملکت کا مطالبہ۔ یہ مطالبہ اس ریزولیشن میں درج تھا جسے لاہور ریزولیشن کہا جاتا ہے، اور فضل الحق صاحب نے (جنہیں شیر بنگال کہہ کر پکارا جاتا تھا) پیش کیا تھا۔

گذشتہ چند سالوں میں اس ملک کے دو بازوؤں میں باہمی مناقشت کی وجہ سے اس ریزولیشن کے متعلق ایک تلخ سی بحث کا از سر نو آغاز کر دیا گیا ہے۔ پہلے ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن نے اور پھر مولانا بھاشانی نے کہا کہ لاہور ریزولیشن میں دو آزاد مملکتوں کا تصور موجود ہے۔ ایک مشرقی بازو میں، اور ایک مغربی بازو میں۔

یہ لاہور ریزولیشن کی دیانتدارانہ تعبیر نہیں۔

قیام پاکستان کے وقت سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کسی نے بھی اس ریزولیشن کو سنجیدگی سے یہ معنی نہیں پہنائے تھے۔ لاہور ریزولیشن سے مقصود یہ تھا کہ پاکستان میں پورا پنجاب، پورا بنگال اور آسام مدغم کر دیا جائے۔ چونکہ (آخرالامر) پنجاب اور بنگال تقسیم ہو گئے اور آسام پاکستان کو مل ہی نہ سکا تو تشکیل پاکستان کے وقت لاہور ریزولیشن کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا۔ علاوہ بریں، اس بحث کا ملخص اس حقیقت میں مضمر ہے کہ جب انگریزوں نے انڈین انڈیپینڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء کی رو سے اقتدار کو منتقل کیا ہے تو اس وقت تین آزاد مملکتیں تخلیق نہیں کی گئی تھیں، صرف دو ہی کی گئی تھیں۔ ایک انڈیا اور دوسری پاکستان۔

ہمارے دل میں مسٹر بھٹو کا صدر مملکت ہونے کی جہت سے بےحد احترام ہے اس لئے جب ہم نے سابقہ صفحات میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ صدر بھٹو کا یہ دعویٰ کہ لاہور ریزولیشن اور قائداعظمؒ کی تقاریر کی رو سے پاکستان سے مراد

دو الگ الگ آزاد مملکتیں تھیں تاریخی حقائق کے خلاف ہے تو ہم نے اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اب جبکہ وہ خود فرما رہے ہیں کہ لاہور ریزولیوشن کی اس قسم کی تعبیر دیانتدارانہ نہیں کہلا سکتی تو ان کے اس اپنے اعتراف کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

مسٹر بھٹو کی اس کتاب میں صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں کہا گیا ہو کہ لاہور ریزولیوشن سے مراد ایک آزاد مملکت کا قیام تھا، دو کا نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے۔ مثلاً مشرقی پاکستان کے ابتدائے ۱۹۷۱ء کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> ۲۳ مارچ یوم پاکستان تھا۔ اکتیس سال ہوئے اس دن لاہور ریزولیوشن پاس ہوا تھا جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ رہائش گاہ (HOME LAND) اور آزاد مملکت پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

> پاکستان، مشرقی پاکستان کے باشندوں پر جبراً مسلط نہیں کیا گیا تھا۔ ان تمام صوبوں نے جن کے مجموعہ کا نام پاکستان ہے رضاکارانہ طور پر ایک آزاد مملکت کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ (صہ۲)

کتاب کے آخری صفحات میں رقمطراز ہیں :-

> میں نے شروع میں کہا تھا کہ ہماری داستان کا نقطۂ آغاز ۱۹۴۰ء کا لاہور ریزولیوشن ہے۔ یہ تاریخ محض اتفاقی سی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھئے تو پاکستان کا آغاز ایک ہزار سال پہلے ہو چکا تھا جب محمد بن قاسم نے سندھ کی سرزمین پہ قدم رکھا اور اس برصغیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ اس زمانے سے اس برصغیر میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہتے ہیں . . . .
>
> . . . . ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ آزاد مملکتوں کی تخلیق درحقیقت اسی قدیم تقسیم کی رسمی شکل تھی۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے (صہ۸)

اور آخری صفحہ پر کہا گیا ہے،

> اب وقت ہے کہ تمام دنیا پاکستان کو ایک غیر منقسم وحدت کی حیثیت سے تسلیم کر لے۔ اسے فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اگر پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے تو پھر باقیماندہ برصغیر بھی متحد اور سالم نہیں رہ سکیگا۔

یاد رکھیئے :-

> مشرقی پاکستان، پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے (صہ۹۸)

دیگر مختلف مقامات پر مشرقی اور مغربی پاکستان کو، پاکستان کے دو بازو کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً۔

> (۱) تقسیم ہند کے فوری بعد، زبان کے مسئلہ پر، ملک کے دو بازوؤں کے درمیان تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ (صہ۳)
>
> (۲) ون یونٹ نے اس تلخی میں اضافہ کر دیا اور یہ دونوں بازو ایک دوسرے کو دو متحارب مملکتوں کی حیثیت سے دیکھنے لگ گئے۔ (صہ۵)

(۳) میرے خلاف یہ پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ میں دو پاکستان بنانا چاہتا ہوں۔ (ص ۳۶)
(۴) میں نے یحییٰ خان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں مجیب کی اسکیم کے لئے پارٹی نہیں بننا چاہتا کیونکہ اس کا فطری نتیجہ دو پاکستان ہوگا۔ (ص ۴۵)

بہ حیثیت صدر پہلی تقریر میں

"عظیم المیہ" اگست ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم کے نام اپنی پہلی نشر شدہ تقریر میں کہا کہ

میرا اور میرے دوستوں کا دل مشرقی پاکستان میں ہمارے بھائیوں اور ہمارے عوام کے ساتھ ہے۔ مشرقی پاکستان پاکستان کا ایک حصہ ہے جو نہ کبھی الگ ہو سکتا ہے نہ تخلیل ہو سکتا۔ (پاکستان ٹائمز ۲۲/۱۲/۷۱)

صدر بھٹو کے یہ ارشادات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں بجز اس کے کہ انہیں اب یہ سب کچھ بھول گیا ہے۔

(۰)

کانفیڈریشن

گذشتہ صفحات میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ محترم صدر مملکت نے اسمبلی میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ قائد اعظمؒ کے تصور میں دو آزاد پاکستان تھے جن میں وہ کانفیڈریشن کے ذریعے رشتہ استوار رکھنا چاہتے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ دو پاکستان کا تصور قائد اعظمؒ کے حیطۂ خیال تک میں نہیں تھا۔ وہ ایک (واحد) پاکستان متشکل کرنا چاہتے تھے۔ اور جب ان کے پیش نظر دو پاکستان تھے ہی نہیں تو کانفیڈریشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے کانفیڈریشن کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ صدر بھٹو نے اس اسکیم کو منسوب تو قائد اعظمؒ کی طرف کیا ہے لیکن درحقیقت اب یہ اسکیم خود انکے اپنے پیش نظر ہے۔ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے کے معنی دو آزاد مملکتوں کا تسلیم کرنا ہے اور وہ مجیب سے بار بار ملنے کی درخواست (غالباً) اسی لئے کر رہے ہیں کہ اسے کانفیڈریشن پر رضامند کر لیا جائے۔ کانفیڈریشن کے سلسلہ میں انہوں نے ۳۱ اگست ۱۹۷۲ء کو ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کے عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد سے میرا یہی نقطۂ نگاہ تھا۔ پاکستان میں بے شک پانچ صوبے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی تھی کہ ملک کے دو بازو تھے۔ (مجیب کے) چھ نکات کا فیڈرل اسکیم کے مظہر تھے۔ اس اسکیم میں صرف صوبوں کا وجود نہیں تھا۔ اس میں دو متمیز وحدتوں کا تصور تھا جن کے درمیان ہزار میل کا خطۂ زمین حائل ہے۔ ان حالات میں (قابل عمل صورت یہی تھی کہ) دونوں وحدتوں کی اکثریت کو تولِ فیصل کا حق حاصل ہو، نہ یہ کہ ایک وحدت کی اکثریت کے ساتھ دوسری وحدت کی اقلیت ملا کر انہیں یہ حق حاصل ہو۔ مسئلہ صوبوں کا نہیں، مسئلہ دو وحدتوں کا ہے جن کا تشخص الگ الگ ہے۔ اقتصادی مطامح الگ الگ ہیں۔ ترقی کے اقتصادی معیار الگ الگ ہیں۔ اس وقت جب ہم نے یہ کہا کہ سوال صرف پانچ صوبوں کی خود مختاری کا نہیں۔ سوال دو متمیز وحدتوں کے مفاد کے تحفظ کا بھی ہے جو کانفیڈریشن کے تابع ہی حل ہو سکتا ہے، تو رجعت پسند عوام دشمن عناصر نے جان بوجھ کر ہماری مخالفت کی۔ کانفیڈریشن کا یہ

بنیادی تقاضا ہوتا ہے کہ اس میں شامل ہونے والی وحدتوں کو مساوی تسلیم کیا جائے۔ (ڈان کراچی۔ ۲۲ ستمبر)

اس تقریر کی رُو سے صدر بھٹو نے فرمایا ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہنگاموں کے دوران، کانفیڈریشن کی اسکیم انہوں نے پیش کی تھی اور رجعت پسند عناصر نے اس کی مخالفت کی تھی۔

یہاں انہوں نے یہ فرمایا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ انہوں نے "عظیم المیہ" میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے اس میں کہا ہے کہ وہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو پریذیڈنٹ ہاؤس (ڈھاکہ) میں پہنچے تو مجیب انہیں ایک الگ کمرے میں لے گیا اور تنہائی میں مجھ سے کہا کہ مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ آپ (مسٹر بھٹو) مغربی پاکستان میں جو جی چاہے کریں اور مجھے (مجیب کو) مشرقی پاکستان میں آزاد چھوڑ دیں۔ اس نے کہا کہ آپ (مسٹر بھٹو) مغربی پاکستان کے وزیر اعظم بن جائیں۔ اس لئے مجھے کہا کہ فوج پر قطعاً اعتماد نہ کرو۔ اگر انہوں نے پہلے مجھے (مجیب کو) ختم کر دیا تو اس کے بعد آپ کو (بھٹو صاحب کو) بھی ختم کر دیں گے۔ (ص۳۷) مسٹر بھٹو نے اس کا کیا جواب دیا؟ وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا کہ

میں اسے ترجیح دوں گا کہ فوج کے ہاتھوں ہلاک ہو جاؤں بجائے اس کے کہ تاریخ مجھے ہلاک کر دے۔ (ص۳۸)

اس کے بعد مسٹر بھٹو یحییٰ خان کے پاس آئے اور اس سے مجیب کی اسکیم کا ملخص بیان کرنے کے بعد کہا کہ،

میں (مجیب کی) اسکیم کو کس طرح قبول کر سکتا ہوں جس کا عملی نتیجہ پاکستان کو دو ٹکڑے کر دینا ہے (ص۳۸)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

شیخ مجیب الرحمٰن کا مقصد یہ تھا کہ وہ قانوناً اور حقیقتاً مشرقی پاکستان کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے اس کے بعد کوئی بھی مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ ہو جانے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور جب اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جاتا تو پھر مغربی پاکستان کے صوبے بھی اپنی آزادی کا اعلان کرنے کے قابل ہو جاتے۔ (ص۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

۲۳ و ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو عوامی لیگ نے پہلی بار کنفیڈریشن کی اسکیم تجویز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک الگ ملک چاہتے تھے۔ (فطرت کی کس قدر ستم ظریفی تھی کہ یہ اسکیم) ۲۳ مارچ کو پیش ہو رہی تھی جس دن — آج سے کتیس سال پہلے قوم نے لاہور ریزولیوشن پاس کیا تھا جس میں پاکستان کی آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا . . . . ہم میں سے ان لوگوں کے لئے جو اپنی جوانی کے زمانے ہی سے پاکستان کے تصور سے مسحور تھے، یہ ایک کرب انگیز منظر تھا۔ (ص۶۹-۷۰)

چند سطریں آگے جا کر لکھتے ہیں کہ

۲۴ مارچ کی صبح مجیب نے مسٹر غلام مصطفیٰ کھر سے کہا کہ مسٹر بھٹو سے کہو کہ وہ اب بھی میری تجویز مان لیں، اور مغربی پاکستان کے وزیر اعظم بن جائیں۔ مسٹر کھر نے کہا کہ میں آپ کا پیغام مسٹر بھٹو تک پہنچا دوں گا لیکن میرا خیال نہیں کہ وہ آپ کی اسکیم کو قبول کر لیں گے کیونکہ اس سے پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ (ص۷۹)

اس کو مسترد کرنے کے بعد جب مسٹر بھٹو واپس کراچی پہنچے تو انہوں نے پہلا فقرہ یہ کہا تھا کہ

اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا ہے۔

پھر انہوں نے اپریل ۱۹۷۸ء میں بی۔ بی سی (لندن) کے ایک نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے اس واقعہ کو دہرایا اور کہا کہ:-

میں ایسی اسکیم کو کس طرح قبول کر لیتا جس کا نتیجہ پاکستان کی تباہی تھا۔ (ڈان - ۷ اگست ۱۹۷۸ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ (مسٹر بھٹو کے اپنے بیانات کے مطابق) کانفیڈریشن کی اسکیم مجیب نے پیش کی تھی لیکن مسٹر بھٹو نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ اس سے پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور یہ کہ اس سے نہ صرف مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہو جائے گا بلکہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو بھی اپنی آزادی کا اعلان کرنے کی بنیاد مل جائے گی لیکن اب صدر بھٹو یہ فرما رہے ہیں کہ کانفیڈریشن کی اسکیم انہوں نے پیش کی تھی کیونکہ یہی اسکیم ——— پاکستان کو بچا سکتی تھی۔ لیکن وحدت پسند عناصر نے اس کی مخالفت کی اور پاکستان تباہ ہو گیا۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئیے!

(۱)

چھ نکات

صدر بھٹو نے فرمایا ہے کہ اگر مجیب اپنے چھ نکات میں ترمیم کر لے تو وہ (مسٹر بھٹو) اسے اب بھی اقتدار سونپنے کے لئے تیار ہیں۔ (پاکستان ٹائمز یکم ستمبر ۱۹۷۸ء) رسوائے زمانہ "چھ نکات" کے متعلق مسٹر بھٹو کے خیالات کیا تھے، یہ غور سے سننے کے قابل ہیں۔ وہ "عظیم المیہ" میں لکھتے ہیں:-

چھ نکات کا فارمولا من حیث الکل، ایک ایسی کانفیڈریشن کا نقاب پوش منشور تھا جس میں آئینی طور پر علیحدگی کے بیج پوشیدہ تھے (ص۱۱)۔ یہ فارمولا، ہماری قومیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا۔ اس سے پہلے دو پاکستان وجود میں آجاتے اور اس کے بعد یہ ملک پانچ آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جاتا۔ (ص۱۲) اس کی رُو سے یہ مقصد دو مراحل میں حاصل ہوتا۔ (ص۲۷)

اس وضاحت کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

بنا بریں، ہماری پارٹی نے چھ نکات کو یکسر مسترد کر دیا اور اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ اسے ناقدانہ طور پر بھی موضوع بحث بنایا جائے۔ (ص۲۷)

جو لیڈر ان نکات کو تسلیم کر لینے کے حق میں تھے، ان کے متعلق لکھا ہے:-

مغربی پاکستان کے چند ایک لیڈر شروع ہی سے مجیب کی تائید کرنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ مغربی پاکستان میں اپنے اپنے صوبوں کو علیحدہ کرالیں۔ یہ وہی حضرات تھے جنہوں نے تخلیقِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان لیڈروں نے دیکھا کہ چھ نکات میں، ان کے لئے پاکستان کو تباہ کر دینے کا موقعہ تھا۔ (ص۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ مسٹر بھٹو نے چھ نکات کو قریب قریب تسلیم کر لیا تھا صرف ایک آدھ مسئلہ پر انہیں اختلاف تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ نکات:

(۱) ہماری قومیت کی جڑ کاٹ ڈالتے۔

(۲) اس سے ایک ایسی کنفیڈریشن وجود میں آجاتی جس سے پاکستان تباہ ہو جاتا۔

(۳) اس سے نہ صرف مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا بلکہ اس کے بعد مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بھی اپنی اپنی آزادی کا اعلان کرنے میں حق بجانب ہو جاتے۔ اور

(۴) یہی وجہ تھی کہ مغربی پاکستان کے وہ لیڈر انہیں تسلیم کر لینے پر زور دیتے تھے جو شروع سے پاکستان کے مخالف تھے اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ان کے صوبے علیحدگی اختیار کر لیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر مجیب اب صدر بھٹو کی دعوت کو قبول کر کے اپنے چھ نکات میں ذرا سی ترمیم پر رضامند ہو جائے تو کیا اس سے اس فارمولا کا زہر تریاق میں تبدیل ہو جائے گا؟ کیا یہ نکات پھر بھی وہی نتائج پیدا نہیں کریں گے جن نتائج کو خود مسٹر بھٹو نے پاکستانی قومیت کی جڑ کاٹنے اور مملکت پاکستان کو تباہ کر دینے کا موجب قرار دیا تھا؟

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے "المیہ مشرقی پاکستان" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ خدا کا شکر ہے کہ مجیب کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور اس نے پاگلوں کی سی حرکات شروع کر دیں۔ اگر اس کے ہوش و حواس بجا رہتے تو نہایت اطمینان سے اپنی قطعی اکثریت کو ساتھ لے کر مرکزی حکومت پر مسلط ہو جاتا۔ اپنی منشاء کے مطابق آئین مرتب کر لیتا۔ اور پھر اس آئین کی رو سے پاکستان کو جس طرح جی چاہتا تہ و بالا کر کے رکھ دیتا۔ (جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا، مسٹر بھٹو اسے فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے اس خطرہ کا احساس کیا اور مجیب کو برسر اقتدار نہ آنے دیا)

مجیب کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور اس نے یہ روش اختیار نہ کی۔ یہ فطرت کا ہم پر خاص کرم ہوا۔ لیکن اب صدر بھٹو اسے اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ان چند کلیوں پر قناعت کرنے کے بجائے "آؤ" اور سارے گلستان پر قبضہ کر لو۔ اپنی منشاء کے مطابق آئین مرتب کرو، اور جو کچھ تم نے دھاندلی سے کیا ہے اسے آئینی سند عطا کر دو۔ نہ دنیا تمہیں کچھ کہہ سکے گی نہ اہل پاکستان!

کہا جائے گا کہ یہ تو خیر حسنِ ظن کی باتیں ہیں، مسٹر بھٹو کا اصل مقصد کانفیڈریشن قائم کرنا ہے اور کانفیڈریشن کے متعلق کہا جائے گا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے پہلے کانفیڈریشن اگر نقصان رساں تھی بھی، تو اب جبکہ وہ حصہ مملکت علیحدہ ہو گیا ہے، کنفیڈریشن میں کیا نقصان ہے؟

اس میں نقصان وہی ہے جس نقصان کے پیش نظر مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ انہوں نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا تھا اور وہ یہ کہ اس سے مغربی پاکستان کے صوبوں کو بھی اپنی اپنی علیحدگی (آزادی) کا پروانہ مل جائے گا اور یوں ان لیڈروں کے دل کی مراد بر آئے گی جو شروع سے تخلیق پاکستان کے مخالف تھے۔ یہ خطرہ اگر اس وقت موہوم تھا تو اب ایک حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے۔ مغربی پاکستان کے یہ لیڈر اپنے اپنے صوبے کی علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کی ان کارروائیوں کو بہر حال سازش اور بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اگر پاکستان اور "بنگلہ دیش" کی کانفیڈریشن کی سکیم تسلیم کر لی جائے تو وہ اپنی علیحدگی کو آئینی طور پر تسلیم کرا لیں گے۔ یہ ہے اس وقت کانفیڈریشن کا نقصان!

(۰)

مجیب کی ذاتِ شریف

صدر بھٹو مجیب سے ملاقات کی بار بار درخواستیں کر رہے ہیں اور وہ انہیں بار بار ٹھکرا رہا ہے۔ قوم کو کچھ

معلوم نہیں کہ اس ملاقات سے صدر بھٹو کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص طبعاً شریف، دیانتدار اور مخلص ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس سے مجبوراً یا سہواً کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کو جھٹک کر نہیں پھینک دینا چاہیئے بلکہ اسے موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لے لیکن ایک شخص جو شروع سے بدطینت ہو، اس نے تخریب ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق، دیدہ دانستہ کی ہو اور اس پر فخر کر رہا ہو۔ اور کمینگی کا یہ عالم کہ دوسرے کے حسن سلوک کو اس کی حماقت پر محمول کرے اور مصافحہ کے لئے بڑھنے والے ہاتھ پر تھوک دے اس سے کسی خیر کی توقع رکھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ دیکھئے کہ مجیب کے متعلق مسٹر بھٹو کا تجربہ اور خیالات کیا ہیں۔ وہ "عظیم المیہ" میں لکھتے ہیں:-

(۱) مجیب کے دل میں مغربی پاکستان کے لئے سخت نفرت تھی جسے وہ تصنع کے نقاب میں چھپائے رکھتا تھا (ص۱۳)

(۲) ایک آزاد "بنگلہ دیش" کے لئے ہندوستان کی طرف سے سازش تقسیم ہند کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور اگرتلہ کیس کے بعد اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ (ص۵۴)

(۳) مجیب کا منتہائے مقصود ایک آزاد "بنگلہ دیش" تھا۔ (ص۷۵)

(۴) وہ مغربی پاکستان سے سخت نفرت کرتا تھا اور خود پاکستان کے متعلق بھی (اپنی روش میں) کسی فریب میں مبتلا نہیں تھا۔ (ص۷۵)

(۵) ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے میں صدر کے پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ سے ملا۔ دوران گفتگو انہوں نے مجھ سے براہ راست یہ سوال کیا کہ میرے خیال میں مجیب کے حقیقی عزائم کیا ہیں۔ میں نے بلا کسی جھجک اور تامل کے کہا — علیحدگی — (ص۷۵)

(۶) ہم مرکزی حکومت میں عوامی پارٹی کے ساتھ اس لئے اشتراک اقتدار چاہتے تھے کہ اگر انہیں مرکزی انتظام میں بلا شرکت غیرے کنٹرول حاصل ہو جاتا اور مشرقی پاکستان میں ان کی مکمل حکومت ہوتی تو مجیب کو علیحدگی کے لئے آخری قدم اٹھانے سے کوئی نہ روک سکتا۔ (ص۲۰-۱۹)

(۷) جب مجیب کے چھ نکات کو آئینی سند حاصل ہو جاتی، اور خود وہ قانونی طور پر مملکت پاکستان کا وزیر اعظم ہوتا۔ ملک کے انتظام عامہ اور افواج پاکستان پر اس کا کنٹرول ہوتا۔ ادھر مشرقی پاکستان پر بھی اس کی حکومت ہوتی تو اس کے بعد اس کا اگلا قدم اسی طرح اٹھ جاتا جس طرح دن کے بعد رات آجاتی ہے ہمیں ان خطرات کا احساس تھا۔ (ص۲۳)

(۸) یکم مارچ (۱۹۷۱ء) سے پہلے مجیب کی اسکیم یہ تھی کہ وہ دو مراحل میں آئینی علیحدگی اختیار کر لے اس وقت افواج پاکستان کے لئے، اگر ناممکن نہیں تو کم از کم بڑا پریشان کن ہوتا اگر وہ قانون کی رو سے متعین شدہ وزیر اعظم کو باغی قرار دیتے۔ خود یحییٰ خان کے لئے مشکل ہوتا کہ چھ نکات پر مبنی جس آئین کو نیشنل اسمبلی منظور کرتی اسے وہ مسترد کر دیتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا پلان یہ تھا کہ مرحلہ اول میں پاکستان کا وزیر اعظم بن جاتا اور اپنی قوت کو منظم اور مستحکم کر لینے کے بعد، دوسرے مرحلہ پر آزادی کا اعلان کر دیتا۔ (ص۶۳)

(۹) جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد، مشرقی پاکستان کے اس وقت کے گورنر منعم خان نے صدر ایوب کو رپورٹ بھیجی تھی کہ جنگ کے دوران مجیب نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اعلان کر دے کہ وہ آزاد بنگال کا وزیر اعظم ہے۔

اور اس طرح مغربی پاکستان سے تعلق ختم کر لے۔ (ص ۲۸)

(۱۰) صدر بھٹو نے پچھلے دنوں کہا ہے کہ انہوں نے اب فائل دیکھا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مجیب اگرتلہ کیس کی رُو سے واقعی بغاوت کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

یہ ہے وہ مجیب جس کے ساتھ ملاقات کرنے کے لئے صدر بھٹو بار بار درخواستیں کر رہے ہیں۔ اور وہ نہایت ذلت آمیز انداز سے جھڑک دیتا ہے۔ صدر بھٹو نے اس کی جان بخشی کی اور اسے بحفاظت اس کے وطن پہنچا دیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اگر بھٹو سمجھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق قائم کر سکے گا تو وہ اس قابل ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔

اگر مسٹر بھٹو مجیب کے ساتھ اپنی ذاتی حیثیت سے ملنا چاہتے تو یہ ان کا نجی معاملہ ہوتا (انہوں نے عظیم الہ میں کہا ہے کہ جب مجیب جیل میں تھا تو وہ متعدد بار اس کے اہل و عیال کو ملنے گئے تھے۔ اور اگرتلہ کیس میں خود مجیب سے کچہری میں ملے تھے۔ یہ بہرحال ان کا ذاتی تھا) لیکن اب صورتِ حال مختلف ہے۔ اب وہ اس سے بحیثیت صدرِ مملکتِ پاکستان ملنے کی درخواستیں کر رہے ہیں' اور جب وہ ان درخواستوں کو ٹھکراتا ہے تو اس سے ایک فرد کی تذلیل نہیں ہوتی۔ اس سے مملکتِ پاکستان کی تذلیل ہوتی ہے' ملتِ پاکستانیہ کی تحقیر ہوتی ہے۔ اندریں حالات' ہم صدر محترم سے گزارش کریں گے کہ یا تو وہ قوم کو بتائیں کہ وہ بلند مقاصد کیا ہیں جن کی خاطر وہ اس قدر ذلت آمیز برتاؤ تک برداشت کر رہے ہیں اور یا ملک اور قوم کو اس ذلت سے محفوظ رکھیں۔ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکے کہ اس قسم کے غدار سے ہمارا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟

～～～～ (۰) ～～～～

اعترافِ حقیقت

کہا یہ جاتا ہے کہ "بنگلہ دیش" ایک حقیقت (REALITY) ہے جسے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت' ہے کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ:-

(۱) مشرقی پاکستان' مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ تھا۔

(۲) اس صوبہ نے مملکت کے خلاف بغاوت کی۔ اور بیرونی طاقتوں کی مدد سے اس میں کامیابی حاصل کر کے اپنی آزاد مملکت کا اعلان کر دیا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا حقیقت اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ اس حقیقت کو تسلیم کیجئے کہ "بنگلہ دیش" کی حکومت ایک باغی حکومت ہے۔ جن لیڈروں نے اس حکومت کو قائم کیا ہے وہ بغاوت کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں جس کی انہیں سزا ملنی چاہیئے۔ اور جن طاقتوں نے ان کی مدد کی ہے وہ باغیوں کی مدد کرنے کے جرم کی مرتکب ہیں۔ ان پر عالمی عدالت میں مقدمہ چلنا چاہیئے۔ یہ ہے حقیقت۔

لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ "بنگلہ دیش" نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ہے اس لئے ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وہ ایک آزاد مملکت ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کا موقف یہ ہے کہ اگر کسی مملکت کا کوئی صوبہ (یا حصہ)

اس سے بغاوت اختیار کرے اور اس میں کامیاب ہو جائے تو آپ تسلیم کرلیں کہ اس کا یہ اقدام حق بجانب تھا اور اُس مملکت کی حیثیت قانونی قرار پا گئی ہے۔ اگر آپ کا یہی موقف ہے اور اسی کا نام حقیقت کا تسلیم کرلینا ہے تو پھر سوچیے کہ دنیا کی کوئی مملکت بھی مستحکم رہ سکتی ہے؟ اس "اصول" کی رُو سے مشرقی پاکستان نے بغاوت کی اور آپ نے اسکے اس اقدام کو حق بجانب تسلیم کر لیا۔ کل کو (جیسا کہ مسٹر بھٹو نے "عظیم المیہ" میں متعدد بار کہا ہے) مغربی پاکستان کے مختلف صوبے بھی بغاوت اختیار کرلیں اور اس میں کامیاب ہو جائیں تو آپ کو ان کے اس اقدام کو بھی حق بجانب تسلیم کرنا ہوگا۔

لیکن ہم جو کہہ رہے ہیں کہ "آپ کو اسے بھی حق بجانب تسلیم کرنا ہوگا" تو اس میں "آپ" سے مراد کیا ہے۔ مشرقی پاکستان نے اعلانِ آزادی کیا تو مغربی پاکستان موجود تھا جسے دنیا نے بدستور پاکستان مانا۔ اس "پاکستان" نے مشرقی پاکستان کے اس اقدام کو حق بجانب تسلیم کر لیا۔ اگر مغربی پاکستان کے صوبوں نے بھی یہی کچھ کیا تو وہ "پاکستان" کہاں ہوگا، جس کے سامنے یہ سوال پیش ہوگا کہ وہ ان صوبوں کے اس اقدام کو حق بجانب تسلیم کرتا ہے یا نہیں! اگر جراٴت عرض معاف کی جائے تو ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اگر حالات اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے تو (خاکم بدہن) پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے پر نہیں رہے گا۔ (اس سلسلہ میں اس مقالہ کو بھی دیکھیے جو چند صفحات آگے جا کر "پنجاب کے مسائل" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔

———— (۰) ————

بہرحال، بات چلی تھی صدر بھٹو کی اسمبلی کی تقریر سے۔ ہم نے دیکھا کہ اس سے ان کا مقصد بالواسطہ "بنگلہ دیش" کے تسلیم کئے جانے کے حق میں دلائل مہیا کرنا تھا لیکن حقائق کا تجزیہ کرنے کے بعد نظر آیا کہ ان کے وہ دلائل نہ صرف یہ کہ بہت کمزور تھے بلکہ خود ان کی سابقہ تحریروں کے بھی خلاف تھے۔ ہم صدر محترم کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اگر ان کے ذہن میں یہ ہے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ قوم کو کھلے کھلے الفاظ میں ایسا بتا دیں، اور پھر اسے صحیح دلائل و شواہد سے مطمئن کریں کہ ایسا کرنا پاکستان کے لئے مفید ہوگا۔ اگر یہ دلائل محکم ہوئے تو قوم مطمئن ہو جائے گی، اور ان کا (صدر بھٹو کا) اعتماد مستحکم۔ ورنہ جس انداز سے اس ایشوع کو وہ اب پیش کر رہے ہیں (جراٴت اظہار معاف کی جائے تو ہم عرض کریں کہ) اس سے کم از کم قوم کے اہل فکر طبقہ کی نگاہوں میں ان کا اعتماد متزلزل ہو رہا ہے، اور یہ چیز مملکت اور قوم دونوں کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے۔ سربراہ مملکت یا قائد پر اعتماد ہی تو ہے جس سے مملکت کی بنیادیں مضبوط اور قوم کے قلوب مطمئن رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے مطاع کے معتمد علیہ ہونے کا معیار (بلکہ یوں کہیے کہ اس پر امت کے اعتماد کلی کا نتیجہ) یہ بتایا ہے کہ ..... لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۴/۶۵) وہ اس کے فیصلے پر اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں اور اس طرح بطیب خاطر اسکے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ مغربی انداز جمہوریت کی رُو سے جو اعتماد الیکشن میں کامیابی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے وہ حقیقی یا دیرپا اعتماد نہیں ہوتا۔ ایک تو الیکشن میں کامیابی کی وجہ ہر حال میں اعتماد نہیں ہوتی۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اعتماد ہنگامی ہوتا ہے۔ اسے برقرار رکھنے کے لئے عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی الیکشن میں ایک بار کی کامیابی پائدار اعتماد کی ضمانت ہوتی تو ایک بار جیت جانے والی پارٹی اسکے بعد ہر الیکشن میں کامیاب ہوتی۔ وہ جو اگلے الیکشن میں ہار جاتی ہے یا اسے الیکشن جیتنے کے لئے از سر نو تگ و دو

کرنی پڑتی ہے' اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ سابقہ الیکشن میں حاصل شدہ اعتماد پائدار نہیں تھا۔ اس قسم کی آوازیں کہ "ہم نے پانچ سال کے لئے تو رہنا ہی ہے" اس حقیقت کی غماز ہوتی ہیں کہ خود یہ پارٹی محسوس کرتی ہے کہ اس کے اعتماد کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی آوازوں کا مطلب (کھلے الفاظ میں) یہ ہوتا ہے کہ "تم نے ہمیں منتخب کر کے جو حماقت کی ہے تمہیں اس کا خمیازہ کم از کم پانچ سال کے لئے تو بھگتنا ہی ہوگا۔ اس سے پہلے تم ہم سے جان نہیں چھڑا سکتے۔" یہ استبداد کہلاتا ہے' اعتماد نہیں۔ ہم صدر بھٹو سے بادب گزارش کریں گے کہ وہ عملِ پیہم سے قوم کے دل میں اپنا پائدار اعتماد قائم کریں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' اس قسم کا اعتماد جہاں خود ان کی اپنی ذات کے لئے باعثِ طمانیت و تقویت ہوگا' وہاں پاکستان کے لئے بھی موجبِ استحکام و فروغ ہوگا۔ پاکستان کی بقا اور سالمیت کا راز اسی میں ہے کہ لیڈرشپ کو قوم کا کلی اعتماد حاصل ہو۔ اگر قوم کے دل میں اعتماد کی یہ شکل پیدا ہوگئی تو مخالفتوں اور سازشوں کے یہ "شیرِ قالین" جو اس وقت قوم کے لئے پھیلا دا اور خود صدر بھٹو کے لئے موجبِ صد وحشت سامانی بن رہے ہیں' "یوسف بے کارواں" ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن اس قسم کا اعتماد اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو بات کا سچا اور قول کا پکا ہو۔ خالی مجمع آرائیوں سے الیکشن تو جیتے جا سکتے ہیں' قوم کے دل نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کسی زندہ لیڈر کے نام سے قوم کے دل میں وہ حرارت نہیں پیدا ہوتی جو قائد اعظمؒ کے نام سے ہوتی ہے۔ زندہ لیڈروں کو بھی خود اسی (قائد اعظمؒ) کے نام کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنی بلندیٔ سیرت و حسنِ کردار سے قوم کے دل جیت لئے تھے۔ زندہ اور پائندہ وہی لیڈرشپ رہتی ہے جو قوم کا دل جیت لے۔ یہ سمجھ رکھئے کہ:۔

تختِ جم و دارا سرِ راہے بفروشند　　　ایں کوہِ گران است بکاہے بفروشند
باخونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز

———— (ن) ————

اے قوم! تیری غیرت کو کیا ہو گیا؟

پرچہ پرچہ میں جا رہا تھا کہ اخبارات میں ان پاکستانیوں کی الم انگیز داستانیں شائع ہوئیں جنہیں بھارتی سپاہی ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران پکڑ کر لے گئے تھے' اور جو اب نظربندوں کے تبادلہ کی رُو سے پاکستان واپس آئے ہیں۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو ان میں سے صرف ایک واقعہ سنئے:۔

ندوی یونیورسٹی کے سیکنڈ ایئر کے ایک طالب علم اعجاز احمد نے نمائندہ امروز کو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بھارتیوں کی زیادتی کی داستان سناتے ہوئے کہا کہ ہمیں ۱۳ دسمبر کو صبح ۹ بجے موضع بھاگبرہ سے ہندوستانی فوج پکڑ کر نزدیک ہی نیبنے کوٹ چھاؤنی میں لے گئی۔ وہاں سے ہمیں گورداسپور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ہمارے ساتھ موضع بھگواڑی' بہائی پور' شانے اور دو لے چک کی تقریباً سولہ نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو گورداسپور جیل میں ہمارے ساتھ والے چھوٹے سے بلاک میں رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت اچانک زور زور سے رونے اور دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں۔ بعض لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔ ہم سمجھ گئے کہ ان لڑکیوں سے زیادتی کی جا رہی ہے۔ ان کی آبرو پر حملہ ہو رہا ہے لیکن ہم بے بس تھے۔ رات بے چینی میں گزری۔ صبح اٹھتے ہی جب ہم نے اس چیخ و پکار کے بارے میں جیل کے ملازمین سے دریافت کیا' تو انہوں نے کہا کہ بعض لڑکیاں پاگل ہیں اور وہ بلاوجہ چیخیں مار رہی تھیں؟

اعجاز نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آیا اور حقیقت جاننے کے لئے جستجو کرتا رہا۔ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی پر نظر پڑی تو اس کی جو حالت دیکھی وہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس رات کے بعد ان لڑکیوں کو نہ جانے جیل حکام کہاں لے گئے۔

اور یہ لڑکیاں' یہ ہماری بیٹیاں۔ ان نظربندوں کے ساتھ واپس نہیں آئیں!　　　(امروز ۲۰ ستمبر ۱۹۷۲ء)

ہم سرحد' پنجاب' سندھ' بلوچستان کے لیڈروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اب بھی آپ کی غیرت بیدار نہیں ہوگی کہ آپ بھارت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔

———— (پ۔ز) ————

پنجاب کے مسائل

اک دن تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

ہماری الم انگیز داستان کو سمٹا کر بیان کیا جائے تو وہ ان الفاظ میں سامنے آتی ہے۔

(۱) اسلام نے یہ دعوت پیش کی کہ نسل، رنگ، زبان، وطن کی خود ساختہ حد بندیوں سے بالا ہو کر صرف آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت میں وحدت پیدا کی جائے۔ اسے اسلام کا نظریۂ قومیت کہتے ہیں۔

(۲) مسلمانوں نے اس حقیقتِ کبریٰ کو فراموش کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا کہ آئیے! ایک خطۂ زمین میں اس تصور کا احیاء کر کے بکھرے انسانیت میں عالمگیر وحدت کی طرح ڈالیں۔ اس مقصد کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا۔

(۳) مشرقی پاکستان نے اس تصور سے اعراض برتا اور یہ (غیر اسلامی) روش اختیار کر لی کہ قوم کی تشکیل علاقائی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ پاکستان سے الگ ہو گیا۔

(۴) ان کے تتبع میں مغربی پاکستان میں صوبہ جات سندھ اور بلوچستان میں بھی اسی (غیر اسلامی) نظریہ کو بیدار کیا گیا اور انہوں نے علاقائی بنیادوں پر اپنی اپنی الگ قومیت کا دعوےٰ کر دیا۔ اس کا اگلا قدم اپنی اپنی الگ مملکت کا قیام ہوگا۔

(۵) پنجاب اس وقت تک ان جراثیم سے محفوظ تھا۔ یہ علاقائی نہیں بلکہ پاکستانی سطح پر سوچتا ہے۔ اب کوششیں شروع کی گئی ہیں کہ یہ بھی علاقائی سطح پر سوچنا شروع کر دے۔ اس سلسلہ میں جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے ایک کتابچہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — پنجاب کے مسائل — ہمیں یہ کتابچہ اسعد گیلانی صاحب کے ایک گشتی مراسلہ کے ساتھ بغرض تبصرہ موصول ہوا ہے۔ اس مراسلہ میں کہا گیا ہے:۔

اس کتابچہ میں سرکاری اعداد و شمار سے پنجاب کے مسائل کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور غالباً یہ اس موضوع پر پہلی دستاویز ہے۔ اس میں کوئی بات بے ثبوت اور بے دلیل نہیں کہی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب گذشتہ برسوں سے مسلسل محرومی اور بے نیازی کا شکار چلا آ رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پنجاب نے ملک کے دیگر پسماندہ حصوں کے لئے مسلسل قربانی اور ایثار کا رویہ اختیار کیا ہے۔ یہ امر قابلِ ستائش ہے اور اس پر پنجاب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے لیکن الجھے ہوئے مسائل نے پنجاب کے لوگوں میں محرومی کا احساس بتدریج پیدا کر دیا ہے جو اس خطۂ ملک کی ترقی اور بہبودی کے نقطۂ نظر سے بہت مہلک احساس ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ لوگوں میں جذباتیت اور ردِ عمل کی کیفیت مسلسل پرورش پا رہی ہے جو رائے عامہ کی شبہ ت

تربیت میں رکاوٹ ثابت ہونے لگی ہے۔

اہل پنجاب کے دل میں اس "محرومی" کا احساس کبھی پیدا نہیں ہوا، اس لئے کہ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا اس نے اسے اپنی محرومی سمجھا ہی نہیں۔ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ یہاں بھی اس احساس کو پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس کتابچہ میں پہلے پنجاب کے حق میں مدح و توصیف کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

پنجاب پاکستان کا اناج گھر ہے۔ اس کے اندر سے عملاً پاٹلی چیری سے خراسان تک جاتا ہے۔ پنجاب پاکستان کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ وہ بھارت کے ساتھ رُو در رُو اور سینہ بسینہ پانچ سو میل تک کھڑا ہے۔ پنجاب نظریہ پاکستان کا علمبردار ہے اور اس ملک کو ایک نظریاتی مملکت قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد نہایت ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں ــــ لیکن ــــ آتا ہے۔ اور اس کا انداز یہ ہے۔

پنجاب آج بھی اتنا ہی ترقی یافتہ ہے جس قدر ترقی تقسیم سے قبل اس نے اپنے دور غلامی میں کر لی تھی۔

اس کے بعد سے وہ مسلسل ایثار و قربانی ہی کرتا چلا آ رہا ہے، چاہے قیادت سے محرومی کے سبب یا اپنی فراخ دلی یا عالی حوصلگی کے سبب۔ اس لئے کہ پنجاب میں علاقائی تعصبات کا نام و نشان بھی نہیں۔ وہ اپنے برادر علاقوں کی خاطر اور وسیع تر ملکی مفاد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہیگا۔ لیکن ــــ

پنجاب کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی بزرگی یا قربانی کا اعتراف کہیں نہیں پایا جاتا۔

اور انتہائی غمخواری اور جانسوزی کے ساتھ مشورہ یہ دیا جاتا ہے کہ:

پنجاب اگر ایک ملک کے اندر ایک جغرافیائی خطہ ہے تو اسے اپنے علاقے کی ضروریات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اسی حیثیت سے سوچنا چاہیئے۔ اس کے افراد کو بھی صحافت کو بھی۔ ورنہ یہ بڑا بھائی بھی کہلائے گا، اور چھوٹوں کے جوتے بھی کھائے گا۔

نفسیاتی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کے جذبات کسی اور طریق سے مشتعل نہ ہوں تو آخری حربہ کے طور پر اس سے کہا جائے کہ تو بڑا ہی بے غیرت اور بے حمیت ہے جو تیرے ساتھ اتنا کچھ ہو رہا ہے اور تجھے پھر بھی اپنی عزتِ نفس کا کچھ خیال نہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتابچہ میں اس حربہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لکھا ہے:

خطۂ پنجاب بے شمار خوبیوں کی سرزمین ہے اور اس کے باشندے قوتِ عمل اور قوتِ کار میں بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اگر یہ خطہ کوئی جزیرہ ہوتا تو شاید دنیا کے فاتح ممالک میں سے ہوتا۔ لیکن شمالی ہند کے ایک صوبہ کی حیثیت میں تاریخی طور پر طویل صدیوں تک فاتحینِ ہند کی گذرگاہ رہا ہے جس میں سے فاتحین کی فوجیں صدیوں تک گذرتی رہی ہیں۔ ایسے علاقہ میں جہاں اجنبیوں کے لئے وسعتِ قلبی اور فراخ دلی پیدا ہو جاتی ہے وہاں پردیسی ماہیا کا تصور بڑھ کر بے حمیتی کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور افرادِ خطہ میں کرایہ پر کام کرنے کی جبلت پیوست ہو جاتی ہے۔

"بے حمیتی" کا طعن کسی قوم کے لئے بہت بڑی گالی ہوتا ہے اور اس طعن کے جواب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ہم، قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا۔ خاموشی سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

ان تمہیدات کے بعد کتابچہ نگار اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> پنجاب ایک جغرافیائی خطہ ہے لیکن یہاں کے لوگوں کا ذوق آفاقی اور ان کی سوچ غیر علاقائی ہے۔ یہ افتاد طبع ایک نظریاتی قیادت کی طلبگار رہی ہے۔ بلاشبہ نظریاتی اور آفاقی راہ نمائی علاقائی قیادت سے بالاتر منصب ہے لیکن اس رہنمائی اور قیادت کی شناخت ان میں ابھی موجود نہیں۔ اگر ان میں ایسی قیادت کی شناخت ہوتی تو اس خطے کے لوگ آفاق گیری کا حوصلہ بھی رکھتے لیکن بدقسمتی نے انہیں یہیں گھیر لیا ہے۔ ان کی افتاد طبع نظریاتی قیادت چاہتی ہے اور ان کی سادگی اور کوتاہ نظری انہیں نظری قیادت پا لینے سے محروم رکھتی ہے۔

اس حسن طلب کا صغریٰ کبریٰ یوں بنا کہ (۱) اہل پنجاب کو ایک جدید قیادت کی ضرورت ہے۔ (۲) وہ قیادت ان کے اندر موجود ہے لیکن (۳) افسوس کہ یہ لوگ نگہ حقیقت شناس سے محروم ہیں۔ اس لئے اس قیادت کو پہچانتے نہیں اسکے بعد ہے

> جس طرح صورت حال یہ بنا دی گئی ہے کہ جو بدبخت اسلام کو گالی دینا چاہتا ہے وہ جماعت اسلامی کو گالی دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص پاکستان کو گالی دینا چاہتا ہے وہ پنجاب کو گالی دیتا ہے۔ ایک مملکت کا محافظ ہے اور دوسرا مملکت کی روح کا محافظ لیکن دونوں میں باہمی شناخت ابھی پوری طرح نہیں ہے۔

اس "قیادت" کو پہچاننے کے بعد کیا کیا جائے۔ سنیئے۔ کہتے ہیں۔

> گذشتہ انتخاب نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اگر ارباب اقتدار میں کوئی صاحب بصیرت اور محب وطن ہوتا تو ان نتائج کو دیکھتے ہی ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیتا۔

یعنی "قیادت" کی شناخت کے بعد پہلا عملی قدم یہ ہونا چاہیئے کہ گذشتہ انتخابات کو کالعدم قرار دلایا جائے۔ اس کے بعد اگلا قدم اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اٹھایا جائے۔ کہ

> پنجاب صوبائی خود مختاری سے ہمیشہ محروم رہا ہے جس طرح مشرقی پاکستان جب تک رہا اس میں کبھی مرکزی حکومت موثر نہیں ہوتی تھی۔ وہاں سب کچھ صوبائی حکومت ہی کرتی تھی۔ اسی طرح پنجاب جب سے پاکستان میں ہے اس میں کبھی کوئی صوبائی حکومت موثر نہیں ہوئی۔ یہاں ہمیشہ علاقہ خاص کی طرح مرکزی حکومت ہی براہ راست موثر رہتی ہے۔

یعنی دوسرے صوبوں کی طرح "مرکز سے علیحدگی اختیار کر کے" اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا جائے۔ کتابچہ میں ایک جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ

> پنجاب نے اب تک کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔

یہ "کارنامہ" جسے اب تجویز کیا جا رہا ہے، پنجاب کا معرکہ آرا تاریخی کارنامہ ہو گا جس سے پنجاب کے ماتھے سے اس بدنامی کا داغ دھل جائے گا کہ اس نے اب تک کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا!

یہ ہے اس کتابچہ کی رو سے پنجاب کے مسائل کا حل۔ یعنی یہ کہ پنجاب جماعت اسلامی کی قیادت قبول کر کے اسی مقام پر آ جائے جس مقام پہ دوسرے صوبے ہیں اور اس طرح پاکستان کے کفن میں آخری میخ ٹھونک دے!!

(۷)

ہم نے جب بھی پنجاب کے متعلق کچھ لکھنا چاہا یہ احساس عنان گیر ہو گیا کہ مرزبوم کی جہت سے ہمارا تعلق بھی اتفاق سے

اسی سرزمین سے ہے لیکن اہلِ پنجاب کو اب جو یہ نئی پٹی پڑھائی جا رہی ہے، اس کے تباہ کن نتائج کے خدشات کا تقاضا ہے کہ ہم اس احساس کی گرفت سے نکل کر پاکستان کے مفادِ کلی کی خاطر اس موضوع پر ذرا کھل کر بات کریں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ‌بچے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

ہم شروع ہی میں اس حقیقت کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم قرآنی تعلیم کے مبلغ ہیں جس کی رو سے نسل، زبان یا وطن کی نسبت سے مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق و تمیز پیدا کرنا، اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے اور ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک ہمارا مشن ان غیر اسلامی تصورات کے خلاف جہاد ہے۔ اس وقت ہم جو کچھ لکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ وہ کسی خاص خطہ یا اس خطے کے رہنے والوں کی وکالت نہیں۔ اس سے مقصود پاکستان کی سالمیت کے لئے، قوم کو اس نئے فتنے کے مضمرات سے آگاہ کرنا ہے۔

پرویز صاحبؒ نے اپنے (۱۳ اگست ۱۹۷۲ء کے) خطاب میں کہا تھا کہ خوش قسمتی سے خطۂ پنجاب ابھی تک نسلی، لسانی، علاقائی تعصبات سے پاک ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز اس کی فضاؤں میں حضرت علامہ (اقبالؒ) کا آفاق گیر انسانیت ساز، قرآنی پیغام نغمہ بار ہے۔ بات اقبالؒ سے بھی پیچھے جاتی ہے۔ سرسیدؒ نے یہاں کے مسلمانوں کو "زندہ دلانِ پنجاب" کہہ کر پکارا تھا۔ ہندوستان میں جتنی تحریکیں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے اٹھیں، ان کا اولین گہوارہ خطۂ پنجاب ہی تھا۔ یہ اس کی نگہِ آفاق گیر کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں کہیں کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ جنگِ بلقان میں یہ وہاں کے مسلمانوں کے مصائب پر تڑپ تڑپ اٹھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کی محبت نے ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام قرار دے دی حالانکہ یہ اس زمانے میں انگریزوں کے محکوم تھے اور ترک جنگ میں انگریزوں کے حریف۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں، انہوں نے

غازی مصطفےٰ پاشا کمال وسے تیریاں دور بلائیاں

کی آہِ سحرگاہی اور فغانِ نیم شبی سے عرش کے کنگورے ہلا دیئے۔ ہجرت کی تحریک میں انہوں نے اس جنون کے مظاہرے کئے جن پر دنیا کی خردمندی آج تک ششدر و حیران ہے۔ شہید گنج مسجد کی دیوار وا لئے انہوں نے بیباکانہ سینے میں گولیاں کھائی ہیں۔ ناموسِ رسالت کے تحفظ میں انہوں نے عشقِ بلاانگیز کے وہ مظاہرے کئے جن کی یاد ابد تک سینوں میں حرارت پیدا کرتی رہے گی۔ آپ ان کے اجتہادی فیصلوں کی غلطیاں گنا سکتے ہیں لیکن اسلام کی خاطر ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ اور پھر تحریکِ پاکستان میں انہوں نے جس جوشِ کردار کا ثبوت دیا اس پر قائدِ اعظمؒ لے خط پات ہمیشہ گواہ رہیں گے۔ تقسیمِ ہند کے عواقب میں انہوں نے لاکھوں کی تعداد میں ستم بردہ مہاجرین کے قافلوں کا استقبال جس خندہ پیشانی سے کیا اور جس فراخ حوصلگی سے اپنا سب کچھ ان کے لئے حاضر کر دیا اس نے انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ کشمیر کے محاذ پر قبائلیوں کے ہمدوش یہی جیالے سر بکف میدانِ کارزار میں نظر آتے تھے۔ جنگِ ستمبر میں انہوں نے ہندوؤں کو ایسی شکست دی جسے وہ رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔ مشرقی پاکستان کی حفاظت کے سلسلہ میں جن جانبازوں کو بھارت کا قیدی بنا دیا گیا ہے، ان کا تعلق بھی اسی زندگی بخش اور حیات پرور خطہ سے ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء

کی جنگ میں بھی ہندوستان، لاہور ہی کو پاکستان کا قلعہ سمجھتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان کا پاسبان یہی قلعہ ہے۔ اس خطہ نے آج تک نہ اسلام سے غداری کی ہے نہ ملت سے خیانت، پاکستان کی حفاظت کا راز ہندو کے خلاف جذبۂ منافرت ہے، اور یہ جذبہ جس شدت سے اہل پنجاب کے سینے میں مستور اور موجزن ہے، اس کی مثال کہیں نہیں مل سکے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ جب بھی ایسا موقعہ آیا، سرزمین پنجاب کا بچہ بچہ، واہگہ کی سرحد پر کٹ مریگا لیکن ہندو کے ساتھ مفاہمت نہیں کریگا۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں اسے وہ سیاسی اور معاشی حقوق نہیں ملے جن کا یہ از روئے آئین و قوانین حقدار تھا لیکن یہ اس لئے نہیں کہ کوئی ان سے ان حقوق کو زبردستی یا بیوقوف بنا کر چھین کر لے گیا۔ اس نے یہ حقوق برضا و رغبت اپنے پسماندہ بھائیوں کو دے دیئے اور اپنے ان فیصلوں پر کبھی متاسف نہیں ہوا۔ اگر کوئی شخص ان کی اس وسعتِ ظرف اور کشادہ نگہی کو حماقت یا بے عقلی پر محمول کرتا ہے تو اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ... سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست ۔ یاد رکھیئے۔ پنجابی دل کا صاف ہوتا ہے، وہ بیوقوف نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ سمجھتا ہے لیکن اپنی بلند ہمتی اور خود اعتمادی کی بنا پر، دوسروں کی تنگ نظری سے الجھتا نہیں، دیدہ دانستہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ چونکہ پنجابی دل کا کھرا ہے اس لئے یہ ہر پکارنے والے کو بلا تحقیق و تفتیش مخلص سمجھ کر اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ یہی اس کی کمزوری ہے، اور جب کسی کا ساتھ دیتا ہے تو دل و جان سے اس کا ساتھ دیتا ہے اور اس کے اشارۂ ابرو پر ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے جب تک وہ اسے مخلص سمجھتا ہے اسی نہج سے اس کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جونہی اسے پتہ چلے کہ وہ بہروپیہ یا مداری ہے تو جس شدت کے ساتھ آگے بڑھا تھا اسی تیزی سے پیچھے ہٹتا ہے اور صرف پیچھے ہی نہیں ہٹتا بلکہ اپنے متبوع کو بُری طرح الٹا بھی دیتا ہے۔ اس لئے کہ منافقت اس کے ضابطۂ قانون میں سنگین ترین جرم ہے، یہ اسے کبھی معاف نہیں کرتا۔ آپ پنجاب میں اٹھنے والی مختلف تحریکوں پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ ہر داعی کی آواز پر کس طرح عوام کے لشکر اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ جونہی انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی آواز میں مخلص نہیں انہوں نے کس تیزی سے اس کا ساتھ چھوڑا۔ اور اس نے باقی زندگی کن نامرادیوں میں گذاری۔

~~~~~~~~(۰)~~~~~~~~

عام شکایت ہے کہ اس وقت پنجاب میں کوئی لیڈر نہیں۔ اور اس سے اکثر احباب پر مایوسی سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس کی علت پر غور نہیں کرتے۔ تحریک پاکستان کے دوران اہل پنجاب پر یہ حقیقت واضح تھی کہ اس تحریک کی کامیابی لیڈرشپ کے بغیر ممکن نہیں۔ انہوں نے قائداعظمؒ کو اپنا لیڈر تسلیم کیا اور جان و دل سے انکے ساتھ ہو گئے۔ حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے یہ خیال کیا کہ اب کسی لیڈرشپ کی ضرورت باقی نہیں رہی، مملکت وجود میں آگئی ہے۔ اس کا تحفظ حکومت کا فریضہ ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حصولِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ بھی زندہ نہ رہ سکی۔ پنجاب نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔

یہ ہوئی پہلی بات۔ دوسری بات یہ کہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں پنجاب نے کبھی علاقائی بنیادوں پر سوچا ہی نہیں۔ اس لئے اسے کبھی اس کا بھی خیال نہیں آیا کہ پنجاب کے مفادات خطرہ میں ہیں اور ان کے تحفظ کے لئے کسی لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے یہاں علاقائی لیڈرشپ پیدا نہیں ہو سکی۔ باقی صوبوں نے علاقائی مفادات کو پیشِ نظر
~~~~~~~~

رکھا۔ اس لئے وہاں علاقائی لیڈر پیدا ہو گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت مختلف صوبوں میں جس قدر لیڈر ہیں ان کی لیڈرشپ علاقائی ہے۔ آل پاکستان لیڈرشپ کسی کے حصے میں نہیں آئی۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ پنجاب میں لیڈرشپ کا فقدان کیوں ہے۔ یعنی یہ حقیقت کہ پاکستان کی بنیاد پر اس نے لیڈرشپ کی ضرورت نہیں سمجھی اور علاقائی بنیادوں پر سوچنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ آج آپ کسی پنجابی سے بات کریں۔ وہ کبھی اس کا رونا نہیں روئے گا کہ پنجاب کا مستقبل خطرہ میں ہے۔ اس کے مفادات کے تحفظ کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ ہمیشہ اس احساس سے مضطرب و بیقرار نظر آئے گا کہ اسے پاکستان کا مستقبل پر امید نظر نہیں آتا۔

اور یہ حقیقت بڑی خوش آئند ہے کہ یہاں ابھی ایک خطہ ایسا باقی ہے جو پاکستان کے مستقبل کی سوچ لیتا ہے۔ اہل پنجاب کی سمجھ میں اب آہستہ آہستہ یہ بات آنی شروع ہو گئی ہے کہ پاکستان کی حفاظت حکومتوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے پھر لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ جس دن ان کا یہ خیال پختگی حاصل کر گیا، ان میں ایک لیڈرشپ ابھرے گی۔ اگر انہیں اطمینان ہو گیا کہ

(۱) نظریہ پاکستان اس لیڈر کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے، اور اس خطہ زمین کا تحفظ اس کے لئے جزو ایمان ہے وہ (لیڈر) مٹ مٹا جائیگا لیکن ان اصولوں کا کسی کے ساتھ کسی حالت میں بھی سودا نہیں کریگا۔ اور

(۲) نسلی، لسانی، علاقائی ذہنیت اس کے نزدیک پاکستان سے غداری کے مترادف ہے۔

تو وہ دیوانہ وار اس کے ساتھ ہو جائینگے۔ اسی سے پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو سکے گا۔

پاکستان کا تصور بھی اسی خطہ (فیض گاہِ اقبالؒ) سے ابھرا۔ پاکستان کا ریزولیوشن بھی یہیں پاس ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی طرف آنے والوں کی اولین آماجگاہ بھی یہی خطہ زمین بنا۔ ۱۹۶۵ء میں حفاظت پاکستان کا حصار بھی یہی خطہ زمین بنا۔ اور (ہمیں یقین ہے کہ) پاکستان کے مستقبل کی تقدیر بھی اسی خطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ اس لئے کہ اس خطہ کے رہنے والے پاکستانی سطح پر سوچتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ خطہ ان تمام عناصر کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے (خواہ وہ ملک کے اندر ہوں یا باہر) جو پاکستان کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اس کی تازہ ترین شہادت خود ان دشمنوں کی زبان سے سنیئے۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت نے اپنی یکم ستمبر کی اشاعت میں، اپنے نامہ نگار خصوصی (مقیم لندن) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ روس، برطانیہ اور امریکہ ایک خاص اسکیم کی تیاریاں کر رہے ہیں جس کی رُو سے وہ چاہتے ہیں کہ بھارت، کشمیر، بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان کا ایک عظیم تر کنفیڈریشن قائم کر دیا جائے جو جنوبی ایشیا میں چین کے گرد ایک حصار کی شکل اختیار کر جائے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

> روس، بھارت اور برطانیہ کے نزدیک اس گرانڈ کنفیڈریشن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پنجاب اور اس کے عوام ہیں۔ چنانچہ اب انہوں نے مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان میں بھی پنجابی غلبہ کے تصور کا زہریلا پراپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ ..... اس مقصد کے لئے انہوں نے مغربی پاکستان میں چار قومیت کے تصور کو بڑی تیزی کے ساتھ ہوا دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

> معتبر ذرائع کے مطابق ماہ اکتوبر میں مغربی پاکستان میں زبردست خونی ہنگاموں کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔

اس رپورٹ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس وقت بین الاقوامی سیاست میں پنجاب کا کیا مقام ہے اور اسے کس طرح بھارت کے عزائم کی راہ میں سنگِ گراں تصور کیا جاتا ہے اور اسے راستے سے ہٹانے کے لئے کیا کیا منصوبے باندھے جا رہے ہیں

یہ تو ہیں بیرونِ ملک کی پاکستان دشمن طاقتوں کے منصوبے۔ اب اندرونِ ملک کے تخریبی عناصر کی سرگرمیوں کا حال سنیئے۔ روزنامہ مساوات نے اپنی ۹ ستمبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل توحش انگیز رپورٹ شائع کی ہے:۔

"مغربی پاکستان کے کچھ اپوزیشن لیڈر جو آج کل لندن میں جمع ہیں ایک ایسا منصوبہ بنا رہے ہیں جس کے تحت شیخ مجیب کے چھ نکات کو مغربی پاکستان میں نافذ کر کے چاروں صوبوں کا ایک نرم اور کمزور وفاق بنا لیا جائے گا اور اس کے بعد "بنگلہ دیش" کو بھی اس وفاق میں شامل کر لیا جائے گا۔ ابتداء میں "بنگلہ دیش" اس وفاق کا سربراہ ہوگا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو صدر بنایا جائے گا۔ منصوبے کے تحت کچھ عرصہ کے بعد اس مجوزہ وفاق میں افغانستان اور بھارت بھی شامل ہو جائیں گے۔ یہ انکشاف کراچی کے اخبار امن نے کیا ہے اور اس سلسلہ میں یورپ میں ہونے والی سازش کی متعدد تفصیلات بیان کی ہیں۔

"علاوہ ازیں لاہور کے ایک روزنامہ کے نامہ نگار نے لندن سے اطلاع دی ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے اپوزیشن لیڈروں نے لندن میں شیخ مجیب الرحمٰن سے خفیہ سودے بازی کی ہے۔ اس سلسلہ میں برطانیہ کے معتبر اور سنجیدہ اخبار ٹائمز نے بھی اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر کے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ ٹائمز کے مطابق نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان آنکھ کے علاج کے بہانے لندن پہنچ گئے ہیں اور اس طرح چاروں صوبوں کے لیڈر لندن میں جمع ہیں۔ اگرچہ ولی خان دیر سے پہنچے لیکن انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن، بنگلہ دیش کے ذمہ دار نمائندوں اور مغربی پاکستان کے لیڈروں سے بات چیت کی ہے۔ اس گٹھ جوڑ میں سندھ کی نمائندگی محمود ہارون، پنجاب کی نمائندگی ملک غلام جیلانی اور بلوچستان کی نمائندگی سردار اکبر بگٹی کر رہے ہیں۔ ان لیڈروں نے لندن اور جنیوا میں بات چیت کی اور جب یہ لوگ آپس میں متفق ہو گئے تو انہوں نے ولی خان کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ مزید وضاحت چاہتے ہیں تو لندن آ جائیں۔"

"ٹائمز لندن کے مطابق ان چاروں لیڈروں نے شیخ مجیب سے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بھی چھ نکات کی بنیاد پر صوبائی خود مختاری کی آڑ میں آزادی حاصل کر لیں اور بعد میں "بنگلہ دیش" سے رابطہ قائم کر لیا جائے۔ شیخ مجیب کے چھ نکات کا مقصد شروع سے ہی یہ تھا کہ پاکستان کا مفلوجہ ڈھانچہ توڑ دیا جائے اور چار آزاد ریاستیں قائم کی جائیں۔ اس منصوبے میں انہیں کم از کم دو بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی۔"

"ولی خان، محمود ہارون، غلام جیلانی اور اکبر بگٹی نے یہ سمجھوتہ بھی کیا ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو چھ نکات کی بنیاد پر خود مختار ریاستیں بنا دیا جائے اور وقتی طور پر انہیں بہت ہی ڈھیلے وفاقی رابطے کے تحت اکٹھا رکھا جائے اور بعد میں "بنگلہ دیش" کو وفاق کا سربراہ بنا لیا جائے۔ ٹائمز کو اس منصوبے کی تفصیلات کے بارے میں اس قدر اعتماد ہے کہ اس نے یہاں تک پیش گوئی کر دی ہے کہ ولی خان، اکبر بگٹی، محمود ہارون اور غلام جیلانی اپنے اپنے صوبوں کے گورنر بنیں گے۔

لندن کے ایک اور اخبار گرین وچ ٹائمز نے اپنے سفارتی نامہ نگار کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ شیخ مجیب نے مغربی پاکستانی لیڈروں سے مشورے کے بعد برصغیر کے لئے ایک منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت دس سال تک ملک

کا نام پاکستان ہی رہے گا اور اس کے چاروں صوبے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان وفاق میں شامل ہونے کے باوجود اپنے معاملات میں پوری طرح آزاد ہونگے۔ بنگلہ دیش اس وفاق میں شامل ہو جائے گا اور اپنی اکثریت کے زور پر اس وفاق کا سربراہ ہوگا جس کا صدر شیخ مجیب کو بنایا جائے گا۔ ان لیڈروں سے نئے وفاق کے آئین کے خاکہ پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس کے تحت میں گنجائش رکھی جائے گی کہ بعد میں دوسرے ملک بھی اس وفاق میں شامل ہو جائیں۔ خاص طور پر بھارت اور افغانستان۔

"اس ذریعے کے مطابق ولی خان نے شیخ مجیب کی ہدایت پر اس سلسلہ میں لندن پہنچنے سے پہلے کابل میں افغان لیڈروں سے بھی بات چیت کی ہے۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ افغان حکمرانوں نے اس منصوبے کس حد تک اتفاق کیا ہے۔ پھر بھی لندن میں ولی خان کی آمد سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان اس مجوزہ وفاق میں شامل ہونے پر تیار ہے۔ اگلے مہینے خان عبدالغفار خان پاکستان واپس آ رہے ہیں۔ وہ بلوچستان اور سرحد میں رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کریں گے تاکہ جب لندن پلان پر عملدرآمد کا وقت آئے تو یہ صوبے مخالفت نہ کریں۔ ادھر شیخ مجیب کا خیال ہے کہ سندھ میں جی۔ ایم سید ان کا ساتھ دیں گے۔"

"ان لیڈروں کو سب سے زیادہ ڈر پنجاب کی طرف سے ہے جو اس منصوبے کی حمایت نہیں کریگا۔ بلکہ اس کی زبردست مخالفت کرے گا۔ اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لئے پنجاب کی طرف سے ہر قسم کی مخالفت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس ذریعے کے مطابق پنجاب کو قابو میں کرنے کے لئے غیر سیاسی طریقے استعمال کئے جائینگے۔ یہ طریقے کیا ہوں گے، ان کا فیصلہ وقت آنے پر کیا جائے گا۔"

اور دس ستمبر کے نوائے وقت میں ولی خان صاحب کے متعلق حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"مجیب کے سربراہ خان عبدالولی خان نے دھمکی دی ہے کہ اگر مغربی پاکستان میں صوبوں کو خود مختاری دینے سے انکار کیا گیا تو یہ ہولناک اور خون ریز ایجی ٹیشن کا موجب ہوگا۔ کلکتہ کے اخبار "ہندوستان اسٹینڈرڈ" نے اپنے نمائندے سین گپتا کے حوالے سے ولی خان کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آجانے سے دو قوموں کا نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ سین گپتا کے مطابق خان ولی خان نے کہا کہ صدر بھٹو صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن انہیں اس مطالبے کے سامنے جھکنا ہی پڑیگا۔ انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اسے صوبائی خود مختاری نہیں دی گئی تھی۔ مرکز کی تحویل میں صرف تین شعبے رہ جانے چاہئیں۔ امور خارجہ، کرنسی اور دفاع۔ باقی تمام شعبے صوبوں کو سونپ دینے چاہئیں۔ خان ولی خان نے دھمکی دی کہ اگر صوبائی خود مختاری کا یہ مطالبہ نہ مانا گیا تو چھوٹے صوبوں کے عوام ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ اب کوئی بھی یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ کوئی دوسرا ان صوبوں پر حکمرانی کرے۔ سین گپتا نے خان ولی خان سے یہ انٹرویو پشاور سے بیس میل دور چارسدہ میں کیا تھا اور اس انٹرویو میں بنگلہ دیش سے لے کر پاکستانی سیاست اور کلکتہ کی مٹھائیوں سے خان ولی خان کی غیر معمولی رغبت تک کے موضوع زیر بحث آئے۔"

آپ نے دیکھا کہ بیرونی قوتیں ہوں یا اندرونی تخریبی عناصر، ان سب کے نزدیک ان کی پاکستان کو ختم کرنے کی سازش کے راستے میں پنجاب ایک کوہ گراں کی طرح حائل ہے۔ اور اسے راستے سے ہٹانے کے لئے ہر طرح کے منصوبے باندھے

جا رہے ہیں۔

ان سازشوں کے متعلق حکومت کی طرف سے حسب ذیل وضاحت شائع ہوئی ہے۔

"اس وقت لندن میں نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان وزیر اعلیٰ بلوچستان سردار عطاء اللہ مینگل اور بلوچستان کے وزیر خزانہ مسٹر احمد نواز خان بگٹی کی بیک وقت موجودگی پر پاکستان میں اور بیرون پاکستان بھی خاصی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ تینوں لیڈر حکومت پاکستان کے ایما سے آئے ہیں اور وہ یورپ میں کسی جگہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کریں گے۔ دریں اثنا حکومت پاکستان نے پُرزور تردید کی ہے کہ یہ تینوں اصحاب یا کوئی اور پاکستانی شخصیت حکومت پاکستان کے ایما سے شیخ مجیب سے ملنے کے لئے یورپ گئی ہیں۔ خان عبدالولی خان اور سردار عطاء اللہ خان مینگل نے اپنے عزم برطانیہ کی وجہ طبّی علاج بتائی تھی اور مسٹر احمد نواز بگٹی چھٹی پر برطانیہ گئے۔ حکومت انہیں بیرون ملک جانے سے آخر کیوں کر روک سکتی تھی اور اسی طرح حکومت ان کی ایسی سرگرمیوں کی ہرگز ذمہ دار نہیں ہے جن کا وہ اپنے قیام یورپ کے دوران مظاہرہ کریں۔" (نوائے وقت - ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء)

یعنی حکومت ملک کو صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتی ہے کہ جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہ نہ ہمارے ایما سے ہو رہا ہے، نہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ وہ اس باب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتی کہ حکومت ان سازشوں کو کس نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کی روک تھام کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے۔ یہ سازشیں کسی معمولی نوعیت کا جرم نہیں۔ مملکت کے خلاف بغاوت ہے جس کا ارتکاب وہ اس طرح کھلے بندوں کر رہے ہیں اور حکومت، کچھ نہیں بتاتی کہ وہ اس ضمن میں کیا کر رہی ہے۔

بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس وقت صرف پنجاب ایسا خطہ ہے جو پاکستانی سطح پر سوچتا ہے اور باقی صوبوں کے سازشیوں کا منصوبہ یہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسے بھی مجبور کر دیا جائے کہ یہ اس تصور کو چھوڑ کر علاقائی سطح پر سوچے۔ ان دونوں سطحوں میں جو فرق ہے اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ علاقائی سطح پر سوچنے کے معنی یہ ہوں گے کہ

(۱) سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان یا تو "بنگلہ دیش" کی طرح کامل آزاد مملکتیں بن جائیں اور یا ایسی فیڈریشن قائم کر لیں جس میں مرکز نہایت کمزور رہے۔ اس فیڈریشن میں بعد میں، بنگلہ دیش بھی شامل ہو جائے اور مجیب کو اس کا سربراہ بنا دیا جائے۔ یہ مجیب کی چھ نکاتی اسکیم تھی۔

(۲) اس کے بعد اس فیڈرل حکومت کو ایک بڑی کنفیڈریشن میں شامل کر لیا جائے جس کی سربراہی کا روس یا بھارت کو حاصل ہو۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں پاکستان کا نام دنیا کے نقشہ پر باقی نہیں رہے گا۔ اس کے برعکس پنجاب کے پاکستانی سطح پر سوچنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک مضبوط اور مستحکم مرکز کے ماتحت صوبوں کو اپنے اندرونی معاملات کی حد تک اختیارات حاصل ہوں۔ اس مملکت کا نام مملکت پاکستان ہوگا۔

سازشی گروہ کے عزائم یہ ہیں کہ اگر پنجاب اپنے موقف سے نہ ہٹے تو بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسے اپنا موقف بدلنے پر مجبور کر دیا جائے۔

اس وقت تک کے قرائن وشواہد سے مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب اپنے اس موقف سے نہیں ہٹے گا۔ کیونکہ

کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں منقوش ہے۔ خود یہ سازشی عنصر بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ جبھی تو وہ پنجاب میں خون ریزیوں کی پیش گوئی کر رہا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جس پر اس وقت پنجاب کھڑا ہے۔ اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہا تو اس کا نتیجہ ٹکراؤ ہوگا اگر وہ اس ٹکراؤ میں کامیاب ہوگیا تو دنیا کے نقشے پر پاکستان کا نام باقی رہ جائے گا۔ اور اگر وہ ناکام رہا تو نہ پاکستان ہی باقی رہے گا اور نہ پنجاب ہی۔

اور اگر اسے اس راستے پر لگا دیا گیا کہ یہ بھی علاقائی سطح پر سوچے تو پھر (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) پاکستان کا نام تک بھی باقی نہیں رہیگا۔

پنجاب کی سابقہ روایات کی روشنی میں ہمارا اندازہ ہے کہ پنجاب اپنے موقف پر قائم رہیگا اور پاکستان کی بقا کے لئے ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرے گا۔ اس کے لئے یہاں ایک لیڈرشپ ابھرے گی نظریۂ پاکستان پر جس کا ایمان ہوگا اور وہ قائداعظمؒ کے نقشِ قدم پر چل کر، بغیر خون خرابہ کئے، پاکستان کو از سرِ نو مستحکم کر دیگی۔

اہلِ پنجاب سے ہماری درخواست یہ ہے کہ (۱) جو لوگ آپ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ پاکستانی سطح کو چھوڑ کر، علاقائی سطح پر سوچنا شروع کر دیں، آپ ان کی بالکل نہ سنیئے۔ اس سے پاکستان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اور

(۲) تخریبی عناصر کی سازش یہ ہے کہ آپ کو اشتعال دلا کر یہاں فسادات برپا کرا دیئے جائیں جس سے پنجاب کی رگوں کا خون نچڑ جائے اور یہ اٹھنے اور جینے کے قابل نہ رہے۔ آپ ان کے اشتعال میں نہ آئیے۔ نہایت ضبط و تحمل سے کام لیجئے۔ اسی میں آپ کی کامیابی اور پاکستان کی بقا کا راز مضمر ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ خدا کا ارشاد ہے۔

قریب ہفتہ عشرہ تک اس پلان کے خوب خوب چرچے ہوئے۔ مرکزی وزیرِ اطلاعات نے اپنی تقاریر میں قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ ریڈیو اور ٹی۔وی پر اس سلسلہ میں مذاکرات ہوئے جب فضا اس سے پوری طرح متزلزل ہوگئی تو ایک دن یکایک ایوانِ اسمبلی میں مرکزی وزیرِ اطلاعات نے اعلان کر دیا کہ ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ اس پلان کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اسمبلی کے اسپیکر نے اس سلسلہ میں تحریکات التوا پر بحث کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ مرکزی وزیرِ قانون نے فرمایا کہ انہیں صدر بھٹو نے تاکید کر دی ہے کہ اس کے متعلق گفتگو ختم کر دی جائے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر بھٹو اپنے کسی بیان یا پارلیمانی تقریر میں اس امر کی وضاحت کر دینگے لیکن تادمِ تحریر انہوں نے بھی اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا بجز اس کے کہ "دو چار آدمیوں کی سازش ملک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"۔ (حالانکہ یہ دو چار آدمیوں کی سازش ہی تھی جس نے ملک کا آدھا حصہ کٹوا دیا!)

جس طریق سے اس پلان کا چرچا ہوا اور جس انداز سے اسے ختم کر دیا گیا اس سے بعض حلقوں میں یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ یہ سارا قصہ محض افسانہ تھا۔ خدا کرے کہ یہ افسانہ ہی ہو۔ لیکن یہ پلان افسانہ ہو یا حقیقت، اس کی طرف منسوب کردہ کرداروں کے تخریبی عزائم تو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا اس شوشہ سے ابھی تک دل دھڑک رہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسی اکتوبر میں پنجاب میں فسادات ہونے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس خطہ کو ہر تباہی سے محفوظ رکھے۔ اس سلسلہ میں ہماری اہلِ پنجاب سے دردمندانہ التجا ہے کہ اگر انہیں کسی گوشے سے اشتعال بھی دلایا جائے تو وہ کسی صورت میں بھی مشتعل نہ ہوں اور ملک میں کسی قسم کی بدامنی اور بدنظمی پیدا نہ ہونے دیں۔ اسی میں پاکستان کی خیریت ہے۔

(نوشتہ ۲۱ ستمبر ۷۲ء)

(پرویز)

قرآن کریم کے احکامات کی روشنی میں

طلاق کے طریقۂ کار کی تشکیلِ نو

محترم محمد رضاء الرحیم۔ رکن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ۔ اسلام آباد

مسلمانوں میں طلاق کا مروجہ طریقۂ کار بالکلیہ قرآن کریم پر مبنی نہیں ہے۔ کلامِ مجید کی بنیاد پر طلاق کے طریقۂ کار کی جدید تشکیل حیطۂ امکان سے باہر نہیں۔ زیرِ نظر مضمون ایک ایسی ہی کوشش ہے۔

طلاق کا مروجہ طریقۂ کار یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے تو وہ طہر کی تین پے در پے مدتوں میں کلمہ طلاق ادا کر کے ایسا کر سکتا ہے[1]۔ شوہر اگر چاہے تو پہلے اور دوسرے طہر کے دوران رجوع بھی کر سکتا ہے، لیکن تیسرے حیض کے بعد یا عورت کے حاملہ ہونے کی صورت میں وضعِ حمل کے بعد طلاق مکمل ہو جاتی ہے اور رجوع کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر عدت تمام ہونے کے بعد عورت کسی دوسرے شخص سے شادی کر لے اور وہ بھی اس کو طلاق دے دے تو اب وہ پہلے شوہر سے دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔

اس طریقۂ کار کی خرابیاں ذیل میں دیئے ہوئے صحیح اور غلط طریقہ ہائے کار کے مابین موازنہ سے واضح ہوں گی۔

صحیح طریق جب کوئی شوہر طلاق کا ارادہ کرے تو اس کو طلاق دینے بغیر چار مہینے عورت سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ (۲/۲۲۶) اگر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد بھی وہ اپنے ارادہ پر قائم ہے تو وہ پے در پے تین طہروں میں تین مرتبہ طلاق کے کلمات ادا کر کے بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ (۲/۲۲۷ ؛ ۲/۲۲۸ و ۶۵/۱) اس مدت کے ختم ہونے کے بعد طلاق مکمل ہو جاتی ہے۔ (۶۵/۲) لیکن حمل کی صورت میں وضعِ حمل کے بعد طلاق مکمل ہوتی ہے۔ (۶۵/۶۷/۴) طلاق کے فیصل ہو جانے سے قبل شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار رہتا ہے (۲/۲۲۸ ؛ ۶۵/۱ و ۲/۲۲۹) طلاق کے مکمل ہو جانے کے بعد اگر شوہر اور بیوی چاہیں تو وہ دوبارہ بھی شادی کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۲)۔ ان دونوں کی (ازدواجی) زندگی میں یہ پہلی طلاق اور پہلی تجدید نکاح ہوگی۔ (۲/۲۲۹) یہی امر ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں دوسری مرتبہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو دوسری طلاق اور دوسری تجدید نکاح سمجھا جائے گا۔ (۲/۲۲۹) اگر دوسری مرتبہ تجدید نکاح کے بعد بھی شوہر اور بیوی کے تعلقات خراب ہو جائیں تو اب کی بار شوہر کو آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ چاہے تو ہمیشہ کے لئے عورت سے علیحدگی اختیار کر لے اور چاہے تو ہمیشہ کے لئے ساتھ رہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد تجدید نکاح کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی شوہر تیسری مرتبہ بیوی کو طلاق دیدے اور کوئی اور شخص اس عورت سے عام طریقے کے مطابق شادی کر لے

---

[1] فقہ کی رُو سے مروجہ طریقہ یہ بھی ہے کہ خاوند ایک ہی وقت میں تین دفعہ "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر قصہ ختم کر سکتا ہے (طلوعِ اسلام)

اور وہ عام طریقے کے مطابق اس کو طلاق بھی دے دے تو یہ عورت پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی اور مرد سے کر سکتی ہے۔ (۲:۲۳۰)

طلاق کے موجودہ طریقہ کار میں طلاق سے پہلے چار مہینے تک شوہر اور بیوی کے درمیان ازدواجی تعلقات کے تعطل کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم تو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ایلاء کرے تو وہ اس کو فوراً ہی طلاق نہیں دے سکتا بلکہ اس کو چار مہینے تک انتظار کرنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس نے جذبات کی شدت میں آکر یہ فیصلہ کر لیا ہو۔ اس لئے اس کو چار ماہ کا عرصہ دیا گیا ہے تاکہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس امر پر غور کرے کہ وہ بیوی سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے یا ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ انہی چار ماہ کی مدت میں قرآن کریم (۴:۳۵) میں ایک مصالحتی بورڈ کی سفارش کرتا ہے کہ اگر معاملات صلح پذیر ہوں تو وہ بورڈ شوہر اور بیوی کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرے۔ اگر حالات فی الواقع ایسے ہی ہوں کہ طلاق سے مفر نہ ہو تو چار ماہ کی مدت گذر جانے کے بعد طلاق کی اجازت ہے۔ یہ احکام قرآن کریم (۲:۲۲۶ تا ۲۳۲) میں بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں۔

قرآن کریم کے متعلقہ احکام کو سمجھنے میں دوسری غلط فہمی لفظ طلاق کا صحیح مفہوم پہچاننے میں ہوتی ہے۔ طلاق کا مطلب ہے عقدِ نکاح کو ختم کر دینا۔ طلاق دے دینا (TO DIVORCE)۔ لیکن مروجہ مفہوم طلاق کا مطلب لیا جاتا ہے کلماتِ طلاق کو ادا کرنا۔ قرآن کریم جب یہ کہتا ہے کہ طلاق (کی اجازت) صرف دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد (عورت کو) عزت سے رکھا جائے یا مہربانی و محبت سے چھوڑ دیا جائے (۲:۲۲۹) تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عقدِ نکاح کا خاتمہ دو مرتبہ رجوع کی اجازت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسری مرتبہ میں رجوع کی اجازت نہیں۔ مروجہ قاعدہ کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلماتِ طلاق کو تین مرتبہ ادا کرنے سے ہی طلاق مکمل ہو جاتی ہے اور پہلی اور دوسری ادائیگی کے بعد رجوع ممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص تین مرتبہ کلماتِ طلاق ادا کر کے اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہہ کر تین مرتبہ طلاق نہیں دے سکتا کہ "میں طلاق دیتا ہوں۔ میں طلاق دیتا ہوں۔ میں طلاق دیتا ہوں۔" تین مرتبہ طلاق دینے کا مطلب ہے۔ طلاق دینا، تجدید نکاح کرنا۔ طلاق دینا، تجدید نکاح کرنا۔ اور طلاق دینا۔ (۲:۲۲۹) جبکہ مروجہ طریقہ کار کی رُو سے ایسا نہیں ہوتا۔ اور یہ واضح طور پر قرآن کریم سے معارض ہے۔

قرآن کریم نہ صرف کلماتِ طلاق کی ادائیگی کو تین تک محدود کرتا ہے بلکہ وہ طلاق کو بھی تین تک محدود کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے لوگوں کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ یہ جدا جدا معاملات ہیں۔

قرآن کریم کی روشنی میں تشکیل شدہ طلاق کا طریقہ کار موجودہ طریقہ کار سے مندرجہ ذیل نکات میں مختلف ہے۔

قرآن کی رُو سے تشکیل شدہ طریقہ کار	مروجہ طریقہ کار
(۱) طلاق کا فیصلہ کرنے سے قبل چار مہینے انتظار (تربص) کی مدت گذرنی چاہیئے۔	(۱) طلاق کے فیصلے سے قبل چار ماہ کے انتظار کی یہ مدت ضروری نہیں۔
(۲) لفظ طلاق کا قرآنی مفہوم عقدِ نکاح کو ختم کر دینا ہے۔ اس لئے تین طلاق کا مطلب طلاق، تجدید نکاح، طلاق، تجدید نکاح۔ اور پھر طلاق دینا ہے۔	(۲) طلاق کا مفہوم لفظ طلاق بولنا ہے۔ تین طلاق کا مطلب تین مرتبہ یہ کہنا ہے کہ میں نے طلاق دی۔ میں نے طلاق دی۔ میں نے طلاق دی۔

(۳) حیض کی تین مدتیں گذرنے یا وضع حمل کے بعد ایک طلاق مکمل ہو جاتی ہے۔ پہلی اور دوسری طلاق کی صورت میں تجدید نکاح ہو سکتی ہے اور حلالہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۳) تین حیض یا وضع حمل کے بعد حلالہ کے بغیر تجدید نکاح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ تین طلاق کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ طلاق بائن ہو گئی۔

طلاق کا تو تشکیل شدہ طریقۂ کار ہی ہے جو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ زوجہ طریقۂ کار میں پائی جانے والی تمام خرابیوں سے معرّا ہے۔ یہ طریقۂ کار طلاق کی بہتات کو کافی حد تک کم کر دے گا۔ اور طلاق کے ایسے واقعات کلی طور پر ختم ہو جائینگے جن میں غصّہ کی حالت میں طلاق دے کر زندگی بھر کی پشیمانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس طریقۂ کار سے حلالہ کا مکروہ طریقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ قرآن کریم (البقرہ: ۲۳۰) میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اگر ایک عورت کو اس کا دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے تو وہ پہلے شوہر کے لئے ممنوع نہیں رہتی۔ تو تشکیل شدہ طریقۂ کار میں اس اجازت کے غلط استعمال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

(۰)

استدراک

مروجہ اسلام میں صرف طلاق ہی ایسا مسئلہ نہیں جس کا مفہوم اور طریق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس میں بے شمار احکام ایسے ہیں۔ قرآن کریم کی روشنی میں فقہ جدید کی تدوین اسی لئے وقت (نیز دین) کا اہم تقاضا ہے۔ پاکستان کا تصور دینے اور اس کے حصول کے لئے کوشش کرنے والوں کے پیش نظر ایک مقصد یہ بھی تھا۔ لیکن ؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

(۲) قرآن کریم کی روشنی میں طلاق سے متعلق احکام کے سلسلہ میں طلوع اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے نیز ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "قرآنی قوانین و اقدار" میں اس سلسلہ میں قرآنی احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے زیر نظر مقالہ شائع کرنا مناسب سمجھا ہے۔ بایں وجہ کہ

(۱) مقالہ نگار ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے رکن ہیں۔ ایسے ادارہ میں رہتے ہوئے عقل و بصیرت کی روشنی میں قرآن کریم سے استنباطِ احکام کی کوشش، جرأت کی متقاضی اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ صاحب مقالہ نے لکھا تھا کہ ادارہ مذکور نے اس مقالہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں!

(۲) معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مقالہ اس میدان میں (یعنی قرآن کریم سے استنباطِ احکام کے معاملہ میں) نو وارد ہیں۔ اس لئے ان کی تحقیق ہنوز خام ہے۔ بایں ہمہ ان کی کوشش بہرحال مستحق تحسین ہے۔

(۳) مقالہ کی دو شقیں قرآن کریم کے مطابق ہیں:۔

(i) طلاق کا مفہوم عقد نکاح کو ختم کر دینا ہے۔ اور

(ii) تین طلاق سے مراد یہ ہے کہ ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ ایسا ہو سکتا ہے کہ طلاق (یعنی عقد نکاح کے خاتمہ) کے بعد وہ آپس میں نکاح کر لیں۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ (بجز اس کے کہ وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے۔ اور پھر طلاق واقعہ ہو جائے۔

(۴) حسب ذیل شقیں (ہماری بصیرت کی رُو سے) قرآن کریم کے مطابق نہیں۔

(۱) چار مہینے کا انتظار — اس آیت (۲/۲۲۶) کا تعلق ایلاء سے ہے۔ طلاق سے نہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ اپنے تعلقات کو معطل کر دے تو اسے چار ماہ کے اندر فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ عقدِ نکاح کو ختم کرنا چاہتا ہے یا ازدواجی رشتہ کو برقرار رکھنا۔ اوّل الذکر صورت میں اسے وہ طریق کار اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے طلاق کے لئے تجویز کیا ہے

(۲) طلاق، تین حیض یا وضع حمل کے بعد مکمل نہیں ہوتی۔ وہ طلاق کے فیصلہ کے ساتھ ہی مکمل ہو جاتی ہے تین حیض یا وضع حمل کی مدت، عدت کہلاتی ہے۔ عدت کے دوران عورت کسی اور مرد کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔

(۵) قرآن کریم کی رُو سے طلاق انفرادی معاملہ نہیں۔ اس کا فیصلہ معاشرہ (نظامِ حکومت) کیطرف سے ہونا چاہئے۔ اس کے لئے قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ (۱) میاں بیوی میں اختلاف کی صورت میں ایک مصالحتی بورڈ قائم کیا جائے (۴/۳۵) اگر وہ بورڈ اپنی مصالحتی کوششوں میں ناکام ہو جائے تو اس کا نتیجہ طلاق ہوگا۔ اس فیصلہ کی تاریخ سے ان میاں بیوی کے نکاح کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور عورت کی عدت شروع ہو جائے گی۔ دورانِ عدت یہ (سابقہ) میاں بیوی تجدید نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ کی طلاق اور تجدید نکاح ہوگی۔ اسی طرح دوسری مرتبہ بھی ہو سکے گا لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق (عقد نکاح کا انقطاع) ہو جائے تو پھر یہ (سابقہ) میاں بیوی تجدید نکاح نہیں کر سکیں گے۔ ہاں اگر یہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لے اور پھر اس عقد کا بھی (مذکورہ صدر طریقے کے مطابق) خاتمہ ہو جائے، تو یہ (سابقہ میاں بیوی) ایک دوسرے سے نکاح کر سکتے ہیں۔

ایک اور مخلص دوست کی جُدائی

۱۹۳۸ء میں تحریکِ پاکستان میں شرکت کا آغاز ہوا تو جن رفقا نے میرا ساتھ دیا ان میں (ڈاکٹر) عزیز الحسن صاحب ایک نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ نہایت مخلص دوست اور گرمجوش کارکن۔ بلند نگاہ، روشن دماغ، شائستہ ذوق، پاکیزہ سیرت اور مجاہدانہ کردار۔ عمر بھر برادرانہ تعلقات رہے۔ کوئی دو سال ادھر مرکزی سیکرٹریٹ سے ڈپٹی سیکرٹری کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔ طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی۔ میں گزشتہ اگست مری جانے وقت اسلام آباد میں ان سے ملا۔ بہت کمزور نظر آتے تھے۔ لیکن باایں ہمہ عزائم میں وہی بلندی تھی۔ ان کا صاحبزادہ عزیزم ساجد میاں (انجینئر) انہیں بغرضِ علاج اپنے ساتھ کینیڈا لے جا رہا تھا۔ کہنے لگے، واپس آکر لاہور کو مسکن بنا لوں گا۔ اور پھر اسی طرح کام کروں گا جس طرح اس کا آغاز کیا تھا۔ لیکن کینیڈا پہنچنے کے ساتھ ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور میں ایک عمر بھر کے مخلص دوست کی رفاقت سے محروم رہ گیا۔ اس عمر میں اس قسم کے قدیم رفقاء کی جدائی بڑی جگر پاش ہوتی ہے لیکن ان صدمات کو بہرحال برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور انکے پسماندگان اور احباب کو توفیقِ صبر۔ (اشکبار، پرویز)

حقائق و عبر

۱۔ اب بلوچستان کی باری ہے

صوبہ سرحد میں (بالقوہ) نیپ برسرِ اقتدار ہے جس کے منشور میں سیکولر انداز حکومت رکھا گیا ہے۔ خان ولی خان متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ ملک کے آدھے حصے پر بھٹو کی حکومت ہے اور آدھے پر ان کی۔ نیز یہ کہ مرکز اپنے اختیارات میں وہی شعبے رکھے گا جنہیں صوبے اسے تفویض کریں گے۔

سندھ میں جی۔ ایم۔ سید کی اٹھائی ہوئی سیکولرازم اور سندھو دیش کی تحریک بلا روک ٹوک آگے بڑھ رہی ہے۔

اب بلوچستان کی باری آئی ہے۔ حال ہی میں کوئٹہ سے ایک ہفتہ وار جریدہ جاری ہوا ہے جس کا نام ہے "سنگت"۔ وہاں کے وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل نے اس کے اجراء پر مبارک بادی کا پیغام بھیجا ہے جو اس مجلہ کے پہلے شمارہ کے ٹائیٹل پر چھپا ہے۔ نیز وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کا پیغام بھی۔ اس مجلہ کے دوسرے ہی شمارہ میں ایک مقالہ (بلکہ اداریہ) شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کا آئندہ آئین کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ اس کا عنوان ہے۔۔۔ کثیر القومی پاکستان کا نیا دستور۔۔۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:۔

(۱) ملک کے دستور میں سب سے پہلے تو اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ پاکستان ایک کثیر القومی ریاست ہے اور اس میں شامل چاروں قومیتیں ہر لحاظ سے یکساں حقوق کی مالک ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ چاروں صوبوں کو کامل خود مختاری دی جائے اور مرکز کے پاس صرف وہی اختیارات رہیں جن کو چاروں صوبوں کے عوام مرکز کے پاس چھوڑنا چاہیں۔

(۳) تیسری بات یہ کہ ملک کا دستور پورے طور پر سیکولر ہو۔

اس مجلہ کے پہلے شمارہ میں کہا گیا ہے کہ وقت کا اہم ترین "تقاضا" سچ مچ کا سوشلزم ہے جسے اسلامی سوشلزم یا کرسچین سوشلزم یا نیشنل سوشلزم یا ڈیموکریٹک سوشلزم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ سوشلزم کے یہ نت نئے برانڈ عملاً سوشلزم دشمنی کی مختلف صورتیں ہیں۔"

اسی بلوچستان میں "پختونستان نیپ" ہے جس کے سربراہ عبدالصمد خان اچکزئی فرماتے ہیں کہ

"پختونستان ایک حقیقت ہے اور یہ وجود میں آکر رہے گا۔" (سادات۔ ۲۷ اگست ۱۹۷۲ء)

کہو! تم موجودہ حکومت کے دور کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

۲- مطلع عرض ہے!

میاں ممتاز محمد خان دولتانہ حال ہی میں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر مقرر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے، پاکستان کے پچیسویں یوم آزادی کی تقریب پر، بی۔ بی۔ سی کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے (بحوالہ امروز۔ ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء) فرمایا۔

(۱) بچے کھچے پاکستان کو متحد رکھنے کا واحد ذریعہ جمہوریت ہے۔ اب اگر ملک کے اس حصے کو قائم و دائم رکھنا ہے تو ہر قیمت پر جمہوریت قائم رہنی چاہیئے۔ (یعنی "اسلام" کو ہم نے آزما کر دیکھ لیا ہے۔ وہ ملک کو متحد رکھنے میں ناکام رہا ہے۔ اب اسے متحد رکھنے کا واحد ذریعہ جمہوریت ہے!)

(۲) مسلم بنگال کے علیحدہ ہو جانے سے نظریۂ پاکستان متاثر نہیں ہوا۔ ان سے جب سوال کیا گیا کہ مسلم بنگال جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے، اپنا دستور سیکولر اور سوشلسٹ بنیادوں پر مرتب کر رہا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس سے دو قومی نظریہ اور واضح ہو گیا ہے۔ (داد دیجئے اس شاعری کی!)

(۳) انہوں نے کہا کہ پہلی قرارداد پاکستان میں شمال اور مشرق میں دو مسلم ریاستوں کے قیام کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اس سے قبل تو قرارداد پاکستان کا یہ مطلب صرف عطاء الرحمٰن خان، مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن ہی نکالا کرتے تھے تو میاں صاحب جواب ٹال گئے۔ (غالباً انہوں نے اس کے بعد صدر بھٹو سے دریافت کیا ہو گا کہ فرمایئے اس سوال کا میں کیا جواب دوں؟)

یہ میاں صاحب کی منصب سفارت پر فائز ہونے کے بعد پہلی گلفشانی (یعنی مطلع) ہے۔ غزل کے بقایا اشعار کا انتظار کیجئے۔

۳- ہمارے پاس ثبوت موجود ہے

سندھ کے گورنر جناب رسول بخش تالپور نے فرمایا ہے کہ:۔

لسانی فسادات کے پیچھے وہ سازش کارفرما تھی جو سندھ اور پنجاب کے عوام کے درمیان منافرت پھیلانے کے لئے کی گئی تھی۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔ (امروز - ۲۲ اگست ۱۹۷۲ء)

ہمارے ارباب نظم و نسق میں سے ہر ایک کے پاس ملک میں برپا ہونے والی سازشوں اور بغاوتوں کے ثبوت موجود ہیں لیکن وہ انہیں آشکارا نہیں کرتے کیونکہ غالب تاکیداً کہہ گیا ہے کہ

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

۴- جناب شیخ کے نقش قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

جماعت اسلامی کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مداری کے پٹارے میں شعبدہ بازی کا ہر قسم کا سامان رکھتی ہے۔

کہ جس حربہ کی جس وقت ضرورت پڑے اس میں سے نکال لیا جائے اور اسے "عین مطابق اسلام" کہہ کر پیش کر دیا جائے۔ اس جماعت کے امیر کا پیش کردہ سارا اسلام اسی قسم کے تضادات کا مجموعہ ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ جماعت کے ترجمان مجلہ ایشیا کی ۲۷ اگست ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں نعیم صدیقی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — پاکستان میں فتنۂ نفرت و تشدد — اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

اسلام میں نصیحت کے بجائے قوت سے کام لینے کے تین مواقع ہیں۔ ایک میدان جنگ...... دوسرا عدالتگاہ...... اور تیسرا موقع حفاظتِ خود اختیاری کا۔ ان تین مواقع کے علاوہ اسلام نے جبر و تشدد کے حربوں سے کام لینے کی اجازت نہیں دی خصوصاً لوگوں کی اصلاح کرنے، سیاسی تبدیلی لانے اور اسلام کے پاکیزہ نظام کو قائم کرنے کے لئے اختلاف کرنے والوں کو نفرت کا نشانہ بنا کر عام لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور سیاسی حریفوں کو تشدد کی تذلیل لاکر وہ انسان نہیں پیدا کئے جا سکتے اور وہ فضا نہیں بنائی جا سکتی جن کا ہونا اسلامی نظام کے قیام اور اس کے اجراء و نفاذ اور اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔
...... ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم عوام کو محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے بلائیں اور مخاطبین پر تنقید بھی کریں تو محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے کریں۔ اعتقادی۔ اخلاقی۔ اور سیاسی دعوتِ اصلاح کا صحیح راستہ یہی ہے۔

یہ مقالہ ایشیا کی ۲۷ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس سے تین ہی دن پہلے (۲۴ اگست کو) جماعت اسلامی کے قائمقام امیر میاں طفیل محمد نے ناصر باغ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا نہ صرف ہمارا حق نہیں بلکہ یہ ہمارا دینی اور قومی فرض ہے اور ہم نفرت پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔
گلزار احمد صاحب مظاہری نے کہا کہ "ڈاکٹر نذیر کا بدلہ لینے کے بارے میں اگر مودودی صاحب ہمیں منع نہ کر دیتے تو ہم خون کا سمندر بہا دیتے۔" (مساوات ۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۱ء)

نعیم صدیقی صاحب نے جو کچھ کہا اسے بھی اسلام کی تعلیم کہہ کر پیش کیا گیا اور اس کے بالکل برعکس میاں طفیل محمد صاحب نے جو کچھ فرمایا اسے بھی دینی فریضہ قرار دیا۔

لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ جماعت اسلامی نے ۷ نومبر ۱۹۷۰ء کو یوم بدر کی تقریب منائی۔ اس میں ایک صاحب نے انہی میاں صاحب سے سوال کیا کہ:-

جماعت اسلامی سے اختلاف کرنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے مخالف تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے پروگرام کو جمہوری ذرائع سے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے لیکن انتخابات کے نتائج حیرت انگیز طور پر ان کے حق میں نکلے اور اب وہ برملا کہہ رہے ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار آکر سوشلزم نافذ کریں گے۔ کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اسلام جمہوری طریقہ سے غالب نہیں آسکتا۔ غلبہ اسلام کے لئے غیر جمہوری طریقہ ہی مفید رہے گا۔

اس کے جواب میں میاں صاحب نے فرمایا:-

اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ اسلامی نظام غیر جمہوری طریقوں سے بھی قائم ہو سکتا ہے۔ غیر جمہوری طریقوں سے کوئی اور نظام خواہ قائم ہو جائے لیکن اس سے اسلامی نظام کا قیام ہرگز ممکن نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے، مسلط کرنے کا حکم نہیں دیا۔ (ایشیا۔ ۱۴ نومبر ۱۹۷۱ء)

کیا ہم میاں صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ ملک میں نفرت پھیلا کر لوگوں کو اشتعال دلانا اور اس طرح فساد برپا کرانا، جمہوری طریقہ ہے؟ کیا اس سے اسلامی نظام قائم ہوتا ہے یا مسلط کیا جاتا ہے؟

اب اس مقام پر ذرا "بڑے میاں" کی بات بھی سن لیجئے۔ مودودی صاحب اپنی کتاب خطبات میں ارشاد فرماتے ہیں۔

جب اسلام اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات ص ۲۳۹۔ ایڈیشن ۱۹۵۹ء)

فرمائیے نعیم صاحب! اس اسلام کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے!

نعیم صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم عوام کو محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے بلائیں اور مخالفین پر تنقید بھی کریں تو محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے کریں۔ اعتقادی، اخلاقی اور سیاسی دعوتِ اصلاح کا صحیح راستہ یہی ہے"۔

مودودی صاحب نے اپنے کتابچہ — مرتد کی سزا قتل — میں کہا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد پاکستان کے تمام مسلمانوں کو نوٹس دیا جائے گا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر صحیح اسلام قبول کر لیں۔ جو ایسا نہ کریں گے انہیں ایک سال کی مدت ختم ہو جانے کے بعد قتل کر دیا جائے گا۔

کیا نعیم صدیقی صاحب فرمائیں گے کہ "اعتقادی دعوتِ اصلاح" کے اس طریق کے متعلق ان کا کیا ارشاد ہے! کیا یہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف؟

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے تھیلے میں اسلام کے کتنے متضاد ایڈیشن بیک وقت رکھے رہتے ہیں کہ جس قسم کے اسلام کی ضرورت پڑے تھیلے سے نکال کر پیش کر دیا جائے!

دین کے ساتھ اس قسم کا مذاق اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔

۵۔ بھان متی کا کنبہ

بچپن میں واعظوں کی زبانی ایک قصہ سنا کرتے تھے کہ جب حضرت نوحؑ نے کفار کو تنبیہ کی کہ وہ آنے والے سیلاب میں تباہ ہو جائیں گے تو انہوں نے شیطان سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ تم بڑے بڑے مٹکے بنا لو۔ تم ان کے ذریعے تیر کر غرق ہونے سے بچ جاؤ گے۔ جب طوفان آیا اور حضرت نوحؑ نے انہیں اس طرح تیرتے ہوئے دیکھا تو خدا سے عرض کیا کہ انہوں نے تو ہماری ساری اسکیم ناکام بنا دی ہے۔ خدا نے کہا کہ ابھی دیکھو ہم کیا کرتے ہیں! خدا

نے تیز آندھی چلا دی جس سے وہ مٹکے ایک دوسرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے اور کفار سب غرق ہو گئے۔

مسٹر بھٹو نے پارٹی بنائی تو بجائے اس کے کہ پختہ سیرت و کردار کی "کشتیٔ نوح" تیار کرتے، انہوں نے موقعہ پرستوں کے مٹکے ساتھ لے لئے۔ اب صورت یہ ہے کہ آندھی تو ایک طرف مفاد پرستی کی ملکی سی ہوا بھی چلتی ہے تو وہ آپس میں ٹکرانے لگ جاتے ہیں کوثر نیازی صاحب کے اخبار 'شہاب' کی ۳۱ اگست کی اشاعت میں کہا گیا ہے کہ

> گزشتہ دنوں لاہور میں ایک سرکاری ادارے کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک غیر منتخب اور موقعہ پرست وزیر نے کھلے لفظوں میں صدر بھٹو کو چیلنج دیتے ہوئے کہا کہ "یاد رکھو! ہم تمہیں صدارت کی کرسی سے اتار کر حقارت کی کرسی پر بھی بٹھا سکتے ہیں"۔۔۔۔ (جب سندھ میں بدامنی پھیل رہی تھی تو) یہی غیر منتخب وزیر راولپنڈی سے ہی استعفیٰ دینے کا اعلان کر کے مزدوروں کو بھڑکانے کے لئے کراچی پہنچا تھا اور اس نے اپنے ایک اداکار ساتھی کی رفاقت میں مزدوروں کو ہڑتالوں اور گھیراؤ، جلاؤ کی تلقین کی تھی۔۔۔۔۔ اپنی اس مہم میں ناکامی کے بعد اب ان لوگوں نے۔۔۔۔ ایک مرتبہ پھر صدر بھٹو اور ان کے رفقاء پر حملوں کا آغاز کر دیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ غیر منتخب وزیر اور اداکار دونوں پیپلز پارٹی کے ارکان ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کے نوائے وقت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> معلوم ہوا ہے کہ قومی اسمبلی کے ضمن میں حکمران جماعت اور پیپلز پارٹی کے پارلیمانی گروپ میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور اس سلسلہ میں پارلیمانی گروپ کے بیس ارکان پر مشتمل ایک غیر رسمی محاذ بھی قائم ہو گیا ہے۔ ان ارکان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ ملک و قوم کے مفاد کے منافی کسی قانون کی حمایت نہیں کریں گے۔ (اس کے بعد اس خبر میں کہا گیا ہے کہ) حکومت آئین میں کچھ ایسی ترامیم کے بارے میں غور و خوض کر رہی ہے کہ کسی رکن کے پارٹی سے اخراج کے بعد اس کی اسمبلی کی رکنیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

(اخبار میں ان ارکان کے نام بھی دیئے گئے ہیں جنہوں نے اپنی ہی پارٹی کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے)

ہمیں اس سے دلچسپی نہیں کہ پیپلز پارٹی میں اتحاد قائم رہتا ہے یا باہمی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لئے وجہ پریشانی یہ امر ہے کہ صدر بھٹو کے رفقائے کار کی غلط کوششوں (بلکہ حماقتوں) کی وجہ سے قوم میں ان کا (صدر بھٹو کا) وقار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ان کی قوت کار از پارلیمان میں ان کی پارٹی کی یک جہتی ہے اگر اس میں بھی شگاف پڑ گئے اور اس طرح ان کی اکثریت عملاً اقلیت میں تبدیل ہو گئی تو اس سے ملک جس انارکی کا شکار ہو جائیگا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ ہم صدر بھٹو سے بزور درخواست کریں گے کہ وہ ملک کو اس تباہی سے بچانے کے لئے فوری اقدام کریں۔ اس کے لئے ہم پھر اپنے اسی مشورہ کو دہراتے ہیں کہ وہ اپنی پارٹی سے باہر ملک کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے ساتھ ملائیں اور ان کے مشورہ سے ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ملک اس وقت کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس میں ذرا سا تساہل اسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دے گا۔

۶. نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا

گذشتہ جنگِ عظیم کے خاتمے کے دو ایک سال بعد ہمارے ایک دوست یورپ گئے۔ واپس آکر انہوں نے بتایا کہ وہ مغربی جرمنی بھی گئے تھے۔ وہاں حالت یہ دیکھی کہ برلن میں کوئی ایک عمارت بھی صحیح وسالم نہ تھی۔ سارا شہر کھنڈر بن چکا تھا۔ اور پورا ملک ویرانہ اور خرابہ نظر آتا تھا۔ یہ قریب قریب اس زمانے کا ذکر ہے جب ہم مملکتِ پاکستان کے وارث بنے تھے۔ یہ ملک بستا رستا تھا اور یہاں کی ہر شے صحیح و سلامت تھی۔

اس پچیس سال کے عرصہ میں ہم نے کیا کیا' اس پر ہماری مسلسل توحہ خوانی شاہد ہے۔ اس کے برعکس جو سیاح مغربی جرمنی سے ہو کر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے یورپ کا کوئی اور ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کی قوتِ تعمیر اور رفتارِ ترقی کا کیا حال ہے' اسے چھوڑیئے۔ کھیل کا میدان' جسے ہمارے ہاں لہو و لعب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں وہ کیا کر دکھاتے ہیں' اس کی ایک جھلک ہمیں میونخ کی اس نئی آبادی میں نظر آسکتی ہے جس میں آجکل اولمپک کی کھیلیں ہو رہی ہیں۔

اس مقصد کے لئے اس قوم نے آج سے تقریباً چار سال پہلے سات سو چالیس ایکڑ پر مشتمل ایک رقبہ زمین کا انتخاب کیا۔ اس چار سال کے عرصہ میں انہوں نے اس قطعہ زمین پر بارہ ہزار کھلاڑیوں اور عہدیداروں کے لئے اولمپک بستی بسا دی ہے جہاں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے تقریباً چار ہزار صحافیوں کی رہائش و آسائش کا انتظام اس پر مستزاد ہے۔ اسی طرح' ریڈیو اور ٹی۔ وی والوں کے لئے ایک الگ بستی بسائی گئی ہے۔ ان تمام بستیوں میں ٹیلیفون' تار اور دیگر اخباری سہولتیں چوبیس گھنٹے دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں ستائیس میل لمبی نئی سڑکیں بنائی گئی ہیں جو مختلف مراکز سے اولمپک میدان کی طرف آتی ہیں۔ اس سلسلے میں بتیس نئے پُل تعمیر کئے گئے ہیں۔ سڑکوں اور اولمپک میدان کی خوبصورتی میں اضافہ کی غرض سے چار ہزار سات سو پچاس درخت لگائے گئے ہیں' اور نو سو اٹھ فٹ اونچا ایک ٹی۔ وی ٹاور تعمیر کیا گیا ہے جہاں سے مختلف ممالک میں فوری طور پر پروگرام ٹیلی کاسٹ کئے جا رہے ہیں۔ اولمپک میدان سے ملحق ایک جدید ریلوے اسٹیشن اور ایک زمین دوز ریلوے کا اسٹیشن بھی تعمیر کیا گیا ہے جو شہر سے ساٹھ ہزار تماشائیوں کو ایک گھنٹے کے عرصہ میں لا اور واپس لے جا سکتا ہے۔

اولمپک کے کھیلوں کے اسٹیڈیم اس شان کے ہیں جن کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اسٹیڈیم کے چاروں طرف نئے بازار اور ہوٹل تعمیر کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑے اسٹیڈیم میں اسی ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ تیراکی کے اسٹیڈیم میں نو ہزار کی' جمنازیم اسٹیڈیم میں گیارہ ہزار کی۔ سائیکل ریس ٹریک اسٹیڈیم میں پانچ ہزار کی۔ باکسنگ اسٹیڈیم میں سات ہزار کی۔ والی بال اسٹیڈیم میں تین ہزار سات سو اور ہاکی اسٹیڈیم میں دس ہزار تماشائیوں کی نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اولمپک کھیلوں میں قدرتی مناظر مہیا کرنے کے لئے ایک حسین و جمیل مصنوعی جھیل اور ایک دیدہ زیب مصنوعی پہاڑ بھی بنایا گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ تعمیرات عارضی طور پر نہیں بنائی گئیں۔ یہ سب نہایت مضبوط ہیں اور اولمپک تماشہ کے بعد انہیں مختلف رفاہی' تعلیمی اور ثقافتی اداروں کو دے دیا جائے گا۔ (بحوالہ نوائے وقت ۔ ۲۳-۸-۷۲)

قارئین کو معلوم ہے کہ جنگ کے بعد سے جرمنی دو حصوں میں بٹ چکا ہے ___ مشرقی اور مغربی ___ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے مغربی جرمنی، مغربی پاکستان سے بھی چھوٹا علاقہ ہے۔ سوچئے کہ وہ کون سی معجزانہ قوت تھی جس نے جنگ کے تباہ اور ویران کردہ اس ملک کو اتنے ہی سالوں کے عرصہ میں جتنی ہماری آزادی کی عمر ہے "اس بام ترقی پر پہنچا دیا!" یہ کہ قوم کے سامنے ایک متعین نصب العین اور اس نصب العین تک پہنچنے کا عزم۔ اس کے ساتھ دیانت دار راہ نمائی سچ کہا تھا حکیم الامت نے کہ :-

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے   خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

(٥)

۷۔ جمعہ کی چھٹی

پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں یہ "اہم ترین" مسئلہ زیر بحث ہے کہ ہفتہ وار تعطیل کس دن کی جائے۔ جن لوگوں کی نگاہیں ملی اور بین الاقوامی تقاضوں پر ہیں ان کی تجویز ہے کہ چھٹی حسب معمول اتوار کے دن کی رکھی جائے لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ یہ چیز خلاف شریعت ہے۔ دین کا تقاضا ہے کہ جمعہ کے دن کاروبار بند رکھا جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولوی صاحبان کا وہ کونسا دین ہے جس کا یہ تقاضا ہے، ورنہ خدا کے عطا کردہ دین میں جمعہ کے متعلق کچھ اور ہی آیا ہے۔ سورۃ الجمعۃ میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ..... (۶۲/۹-۱۰)

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لئے آواز (اذان) دی جائے تو کاروبار چھوڑ دیا کرو اور اللہ کے ذکر کی طرف لپک کر آجایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو تو۔

اور جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر ملک میں پھیل جاؤ اور رزق خداوندی کی تلاش کرو۔

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم جمعہ کو سارا دن کاروبار بند رکھنے کا تصور نہیں دیتا۔ اس کے برعکس وہ بتاتا ہے کہ کاروبار صرف صلوٰۃ کے وقت کے لئے بند کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کاروبار جاری رکھا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس قسم کے مسائل (کہ ہفتہ میں کون سے دن کاروبار بند رکھا جائے) کا تعلق دین سے نہیں، ملی تقاضوں سے ہے۔ ہم نے جو قرآن کریم کی (مندرجہ بالا) آیات پیش کی ہیں تو وہ یہ بتانے کے لئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت کا یہ جو مطالبہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی "دین کا تقاضا ہے" یہ غلط ہے۔ اگر انہوں نے یہ تقاضا قرآن سے ثابت کرنا ہے تو پھر قرآنی تصریحات خود ان کے مطالبہ کے خلاف جاتی ہیں۔ اگر ہم ہفتہ میں کسی روز بھی چھٹی نہ کرنا چاہیں تو یہ بھی دین کے خلاف نہیں ہوگا، اور اگر ہفتہ کے کسی ایک روز چھٹی کرنا چاہیں تو دین اس سے بھی نہیں روکتا۔

(٥)

۸۔ "کالکے دا بھانیا"

ہندوؤں میں یہ رواج تھا کہ عورت اپنے خاوند کا نام نہیں لیتی تھی۔ اسے "کالکے دا بھانیا" یا "منی دالالہ"

کہہ کر پکارتی تھی۔ داکٹر مسلمان گھرانوں میں بھی یہ رواج عام ہو گیا تھا) ہندو چلا گیا لیکن یہ رواج ہماری صحافت کے لئے چھوڑ گیا۔ آپ اخبارات میں اس قسم کی خبریں روز پڑھتے ہیں۔

> حال ہی میں ایک بہت بڑی جماعت کے ایک نامور لیڈر نے فریقِ مخالف پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس کا خفیہ رابطہ ایک دشمن ملک سے ہے۔ جس سے اسے ایک بیرونی ایجنسی کی معرفت مالی مدد ملتی ہے۔
> اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے ایک نامہ نگار خصوصی نے بڑے سنسنی خیز واقعات کا انکشاف کیا ہے جنہیں ہم سردست صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے ہیں۔

یا اس قسم کے بیانات۔

> ہماری پارٹی کے ایک غیر منتخب وزیر نے ایک سابقہ اداکارہ سے مل کر پارٹی کے سربراہ اور اس کے رفقاء کے خلاف الزام تراشیوں کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ ان کے ساتھ پارٹی کے دیگر متعدد افراد بھی شامل ہیں۔

ذرا سوچئے کہ اس قسم کی خبروں یا بیانات سے قارئین کی معلومات میں کس قدر اضافہ ہو سکتا ہے اور جس مقصد کیلئے آپ انہیں شائع کرتے ہیں وہ کس حد تک پورا! آپ سیدھے طور پر متعلقہ پارٹیوں یا اشخاص کا نام لیجئے تاکہ قارئین ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اس قسم کی خبروں کی اشاعت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ خبریں چھاپ کر الگ ہو جاتے ہیں اور لوگ قیاس آرائیاں کرتے رہیں کہ آپ نے کس کے متعلق بات کی ہے۔ اور ان قیاس آرائیوں میں معلوم وہ کون کون سے بے گناہ افراد کے متعلق بدظنی کا شکار ہو جائیں۔ ایسی ہی تھیں وہ بھارتیں جن کے متعلق کہنے والے نے کہا تھا کہ

دکھلا کے اک جھلک وہ تو پردے میں چھپ گئے ٭ اور کہہ گئے نگاہ سے ڈھونڈا کرے کوئی

جو صحافت قارئین کو نگاہ سے ڈھونڈنے پر مجبور کرے وہ صحافت نہیں کثافت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۔ بات کرو تو صاف واضح، غیر مبہم دو ٹوک بات کرو۔ ذومعنی مبہم یا پہلودار باتیں کرنے کو اس نے منافقین کا شیوہ بتایا ہے۔

(o)

۹۔ یہ سب اسلام کے نام لیوا ہیں

ذیل کی خبریں کلیجہ تھام کر پڑھئے۔

(۱) حکومت بلوچستان جلد ہی ایک آرڈیننس نافذ کر رہی ہے۔ اس آرڈیننس کے تحت ساحل کے تین میل کے اندر اندر غیر بلوچیوں کو مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کر دی جائے گی۔ (امروز ۱۴ ستمبر ۷۲ء)

(۲) بلوچستان کے گورنر مسٹر بزنجو نے کہا ہے کہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قریب ساڑھے پانچ ہزار ملازمین حکومت کو جو دوسرے صوبوں کے رہنے والے ہیں، بلوچستان سے نکال کر ان کے متعلقہ صوبوں میں بھیج دیا جائے۔ اور ان کی جگہ بلوچیوں کو بھرتی کیا جائے۔ (ڈان۔ بابت ۹ ستمبر ۷۲ء)

صوبوں کی نسبت سے قومیتوں کی تشکیل کا یہ پہلا پھل ہے۔ اس کے بعد مزید نتائج کا انتظار فرمائیے۔

(۳) خان عبدالولی خان نے لندن میں کہا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مرکز میں صرف تین چار شعبے رہیں۔ باقی اختیارات صوبوں کی تحویل میں ہوں۔ اور پاکستان کا آئین سیکولر ہو۔　　(ڈان - ۱۳ستمبر ۱۹۷۲ء)

یہ چیز ان کی پارٹی (نیپ) کے منشور میں شامل ہے۔

مفتی محمود صاحب اسلام کے سب سے بڑے اجارہ دار ہونے کے مدعی ہیں۔ انہوں نے نیپ کے ساتھ مل کر حکومت مرتب کی ہے۔ اسلام کے دعویداروں کا سیکولر نظام کے ساتھ مل کر حکومت قائم کرنا؟ ان سے اگلے دنوں پوچھا گیا کہ آپ سیکولرزم کے حامی کس طرح ہو سکتے ہیں انہوں نے جواب میں کہا کہ لوگ سیکولرزم کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے۔ اس کا مطلب ہے غیر فرقہ وارانہ نظام حکومت جو اقلیتوں کے مذہب میں مداخلت نہ کرے۔ یا للعجب! پوچھا گیا کہ خان عبدالولی خان کی سیکولرازم کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے۔ فرمایا۔ ہم اس قسم کی اخباری رپورٹوں پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔　　(ڈان - ۱۷ستمبر)

عام طور پر تعجب کیا جاتا ہے کہ اتنا بڑا عالم دین اور اسلام کے متعلق اس قسم کی باتیں۔ اس کا راز کیا ہے؟ راز کچھ پوشیدہ نہیں۔ ولی خان خان عبدالغفار خان کے صاحبزادے ہیں جو آخری وقت تک پاکستان کے مخالف اور بھارت کی سیکولرازم کے حامی رہے۔ مفتی محمود صاحب مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے شاگردوں میں جو متحدہ قومیت اور بھارت کے سیکولر نظام کے سب سے بڑے مؤید تھے۔ ولی خان صاحب کے والد ماجد کو اور مفتی صاحب کے استاد گرامی کو (پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کی وجہ سے) جو شکست پندار ہوئی یہ دونوں مل کر اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔ یہ ہے ان دونوں میں قدر مشترک ---- اور اسی نظام کی تشکیل جس کے حامی خان عبدالغفار خان اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، ان دونوں کا منتہائے مقصود ---- بات واضح ہے۔

۱۰۔ نیا دینی نصاب

روزنامہ مساوات کی ۱۹ اگست کی اشاعت میں ایک شذرہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ---- نیا دینی نصاب۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "مرکزی وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کا یہ اعلان خوش آئند ہے کہ یکم اکتوبر سے تعلیمی اداروں میں نیا دینی نصاب جاری کر دیا جائے گا۔"

طلوعِ اسلام اس نئے دینی نصاب کے دیکھنے کے لئے چشم براہ ہے۔

اس کے بعد اس شذرہ میں کہا گیا ہے کہ اس نصاب کی ترتیب کے لئے جو کمیٹیاں مقرر کی گئی ہیں ان کی دقت یہ ہوگی کہ

جو کتابیں تاریخ اسلام کی مآخذ شمار ہوتی ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں بلکہ غیروں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان کی تصنیف کے دوران لکھنے والوں کے اپنے سیاسی اور ثقافتی تعصبات نے اپنا کام ضرور دکھایا ہے۔

ہم مؤقر جریدہ مساوات کی اطلاع کے لئے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کتابیں تاریخ اسلام کی مآخذ شمار ہوتی ہیں وہ سب کی سب مسلمانوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ غیر مسلموں نے انہی کتابوں سے اپنی تصانیف مرتب کی ہیں۔

شذرہ کے آخر میں کہا گیا ہے

جہاں تک نیا دینی نصاب جاری کرنے کا تعلق ہے مختلف مسالک فقہ کے اختلافات کے پیش نظر یہ ضروری ہوگا کہ نئے نصاب میں قرآن حکیم کو مشعل راہ بنایا جائے اور تفسیر و تاویل سے احتراز کیا جائے۔ اور قرآن حکیم جس سماجی انقلاب مجاریہ کی دعوت دیتا ہے اس کی شرح پر اکتفا کیا جائے۔ موجودہ دینی نصاب کا محور محض انفرادی اخلاق ہے جبکہ قرآن حکیم اجتماعی عمل پر زور دیتا ہے حتیٰ کہ قرآن حکیم

ستا ذ ہی فرد کو مخاطب کرتا ہے۔ نئے دینی نصاب کی تدوین میں اس بنیادی بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا۔
ہم جریدۂ مساوات کی اس تجویز پر کہ "نئے نصاب میں قرآن حکیم کو مشعلِ راہ بنایا جائے" اسے درخورِ تبریک سمجھتے ہیں اور اس کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم بے شک اجتماعی نظامِ حیات کی دعوت دیتا ہے لیکن اس کے نزدیک اجتماع بہرحال افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے انسانیت ساز اجتماعی نظام کے لئے افراد کی اخلاقی تربیت لاینفک قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی اجتماعی نظام صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک ان افراد کی سیرت' جو اس اجتماعی نظام کے حامل ہیں، پاکیزہ اور ان کا کردار مستقل اقدارِ خداوندی کا مظہر نہ ہو۔ بنا بریں' قرآن کریم پہلے افراد کے دل و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کرتا ہے اور جو معاشرہ ان افراد کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے، اس کے ہاتھوں اجتماعی انقلاب لاتا ہے
جریدہ مساوات نے تو بہرحال قرآن کی بات کی ہے لیکن ہمارے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق کا ارشاد ہے کہ :-

> تعلیمی نصاب میں ایسے مضامین شامل کئے جانے چاہئیں جو انسان کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل میں مفید ثابت ہوں اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت اس بات کی خواہشمند ہے کہ طلبا کو ایسی بامقصد تعلیم دلائی جائے جو ان کے معاشی مسائل حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

تعلیم کا یہ مقصد تو دنیا کی ہر حکومت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اسلام کی اس باب میں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جس میں انسان کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات اور معاشی مسائل کا حل' وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی روشنی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ یہی فرق ایک اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ

از کلیدِ دیں' درِ دنیا کشاد

لیکن یہ بات' تعلیم کے وزیروں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی' قرآن کے فقیروں کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

(۰)

۱۱۔ چوری اور سینہ زوری؟

کراچی سے شام کو شائع ہونے والے اخبار ڈیلی نیوز کی ۱۲ اگست کی اشاعت میں مظہر یوسف نامی کسی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> قائد اعظم نے ایک بار نہیں' بار بار فرمایا کہ پاکستان ایک ماڈرن سیکولر اسٹیٹ ہوگا۔

"ایک بار نہیں، بار بار فرمایا"! اور صاحب مضمون نے اس کی سند میں ایک حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی آپ دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں کس دھڑلے سے جھوٹ بولا جاتا ہے اور اس پر ایسے لوگوں کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا۔

(۰)

۱۲۔ نہایت آسان حل

اسی اخبار (ڈیلی نیوز) کی ۱۹ اگست کی اشاعت میں' ملتِ اسلامیہ کی ایک بیٹی — غزالہ بلوچ — کا ایک خط

شائع ہوا ہے۔ ذرا دل تھام کر پڑھئے۔ لکھا ہے:-

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے۔ لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان ــــ ایک پاکستان ــــ کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے، اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔

اور آگے بڑھیئے:-

بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن سے شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں۔

یہ ہے اس تعلیم کا نتیجہ جو ہم اپنی نئی نسل کو گذشتہ پچیس سال سے دیتے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہ ہے ہماری وہ پود جو اب پروان چڑھ کر ملت پاکستانیہ بن رہی ہے ــــ قارئین کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے اس طالب علم ــــ عزیز الرحمٰن ــــ کا وہ خط تو یاد ہوگا جو طلوع اسلام میں متعدد بار چھپ چکا ہے اور جس میں اس نے اپنے اس دلی صدمہ کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان نے "ہم سے ہمارا اپنا ایشور چھین کر ایک بدیشی خدا ــــ اللہ ــــ ہم پر مسلط کر دیا ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ سندھی کس طرح انہی بنگالیوں کے نقوش قدم پر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور حکومت خاموش بیٹھی دیکھ رہی ہے!

~~~~~~~~ (٠) ~~~~~~~~

۱۳۔ وہی آزمودہ حربہ

مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے سے پہلے بھارت نے یہ پراپیگنڈہ شروع کیا تھا کہ وہاں کے باشندے ہزاروں کی تعداد میں بھارت چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کی تعداد لاکھوں تک بڑھا دی اور انہیں وطن دوبارہ بسانے کے "خالص انسانی جذبات ہمدردی سے مجبور ہو کر" اپنی فوجیں وہاں بھیجدیں۔ بعینہٖ یہی حربہ اب سندھ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ کراچی کے روزنامہ جسارت کی ۱۰ اگست کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ:-

ڈیلی ٹیلیگراف لندن نے اطلاع دی ہے کہ روزانہ تین ہزار کے لگ بھگ ہندو پناہ گزین راجستھان کے سرحدی علاقوں میں پہنچ رہے ہیں۔ اور اب ان کی تعداد ساٹھ ہزار ہو گئی ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے
~~~~~~~~

نمائندے پیٹر گیزل ہرسٹ نے لکھا ہے کہ یہ ہندو چاہتے ہیں کہ انہیں بھارتی شہریت مل جائے کیونکہ بھارتی حکومت فوجوں کی واپسی کے بعد ان لوگوں کو واپس پاکستان بھیجنا چاہتی ہے۔ پیٹر گل (؟) نے لکھا ہے کہ ایسے پچاس ہزار افراد کھلے میدان میں زندگی بسر رہے ہیں۔ صدر بھٹو بھارت کو یقین دلا چکے ہیں کہ یہ پناہ گزیں بلا تکلف پاکستان واپس آسکتے ہیں لیکن خود ان کے خیال میں ان کی واپسی ان کے لئے مناسب نہیں۔

دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں یہ خبر لندن سے مل رہی ہے۔ اپنی حکومت نے ایسی کوئی بات ہمیں بتائی اور نہ ہی ان کی طرف سے اس خبر کی تردید ہماری نظروں سے گزری ہے۔ اور دوسرے یہ کہ پناہ گزینوں کے یہ ریلے جنگ کے زمانے میں بھارت کی طرف نہیں جا رہے تھے؟ امن کے زمانے میں جا رہے ہیں۔ حکومت پاکستان ان کے جانے کے راستے میں تو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کر رہی لیکن ان کی واپسی کے متعلق صدر پاکستان بھارت کو یقین دلا رہے ہیں!

بھارت کی طرف سے اس سمت میں جو اگلا قدم ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ۵ ستمبر کے روزنامہ مساوات میں یہ خبر جلی الفاظ میں شائع ہوئی ہے کہ لندن میں سندھ کی علیحدگی کی سازشیں شروع ہو گئی ہیں۔ ہم ایک عرصہ سے اس کے متعلق دہائی مچا رہے تھے!

(۰)

۴۔ ایک قابلِ اعتراض اصطلاح

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب کا ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیں:

جولائی ۷۲ء کے شمارہ میں ایک دل لگتی بات پڑھی وھو ھذا۔

"یہ ہے قومِ لوط جس کی نسبت سے لواطت کی نہایت ہی مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔" صفحہ ۱

لیکن صفحہ ۹ پر اسی مکروہ اصطلاح کو ہی استعمال کیا گیا ہے۔

"جس کی رو سے لواطت (HOMO - SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا؟"

میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ کیا اس مکروہ اصطلاح کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ کئی تفاسیر میں بھی یہی اصطلاح درج ہے

اگر آپ اس کے برخلاف کچھ کر سکیں (یقیناً آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں) تو ضرور توجہ فرمائیں۔ ایک اولوالعزم پیغمبر کے نام کو بگاڑ کر یہ مکروہ اصطلاح وجود میں لانا ایک بہت ہی بڑی گستاخی ہے۔ مغربی ممالک تو اسے (SODOMY) (HOMO - SEXUALITY) کہیں اور لکھیں اور ہم اسے پیغمبر کے نام سے منسوب کریں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ اصطلاح "عملِ قومِ لوط" کے معنوں ہی میں استعمال ہوتی ہے لیکن (بایں ہمہ) چونکہ اس میں خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر (حضرت لوطؑ) کا اسمِ گرامی ملوث ہوتا ہے اس لئے ہم اس سے متفق ہیں کہ اس کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے۔ ہمارے ہاں اس فعلِ شنیع کے لئے "اغلام" کا لفظ موجود ہے۔ ہم اردو (بلکہ عربی) لکھنے بولنے والے

حضرات سے درخواست کرینگے کہ وہ اس باب میں احتیاط برتیں تاکہ یہ اصطلاح رفتہ رفتہ متروک ہو جائے۔

---- (۰) ----

۱۵۔ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد

برما سے ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندوستان کے باشندے تھے قریب سو سال ہوا کہ ان کے بزرگ برما چلے گئے اور ان کے خاندان نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی۔ بہت اچھا کاروبار تھا کہ حکومت برما نے سب کچھ نیشنلائز کر لیا نتیجہ یہ کہ ہم پائی پائی کے لئے حکومت کے محتاج' فلہذا ان کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ زندگی اس قدر اجیرن ہو گئی کہ ہمیں وہ ملک چھوڑنا پڑا۔

یہ سنکر ہمارے ایک دوست نے ہم سے کہا کہ آپ قرآن کا جو معاشی نظام پیش کرتے ہیں' اس کی رُو سے بھی تو تمام ذرائع پیداوار (بلکہ افراد کی فاضلہ دولت بھی) مملکت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ کیا اس کا نتیجہ بھی وہی نہیں ہوگا جو ہمارے اس برمی دوست نے بتایا ہے۔

اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔

قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد یہ نہیں کہ تمام ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں چلے جائیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ یہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کو رزق بہم پہنچائے۔ اور رزق سے مراد ہے وہ تمام اسباب و وسائل جن سے ان کی جسمانی پرورش' ذہنی صلاحیتوں کی نشو و نما اور انسانی ذات کی تکمیل ہو۔ مملکت اپنے اس اہم فریضہ اور عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک ذرائع رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ وہ اس مقصد کے لئے ذرائع پیداوار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ فلہذا قرآن کے معاشی نظام میں ذرائع پیداوار کا مملکت کی تحویل میں چلے جانا مقصود بالذات نہیں۔ وہ اس عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ جو مملکت افراد معاشرہ (معاشرہ کی اولاد) کے رزق کی ذمہ داری نہیں لیتی' یا اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتی' قرآن کی رُو سے اسے ذرائع رزق کو اپنی تحویل میں لینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

ضرورت رشتہ

دو' ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ باسلیقہ۔ خاندانی۔ خوب سیرت خواتین کے لئے ایسے نوجوانوں کے رشتے مطلوب ہیں جو مستقل اور معقول آمدنی رکھتے ہوں۔ اور عمر ۳۵ اور ۴۰ کے درمیان ہو۔ محکمہ تعلیم کے اساتذہ اور لیکچرز کو ترجیح دی جائے گی۔

(خط و کتابت) بنام "ص ل" معرفت

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

نقد و نظر

۱۔ سقوطِ مشرقی پاکستان

مصنف - صفدر محمود ، ناشر - مکتبہ میری لائبریری لاہور (۷) (پاکستان ، طابع - مکتبہ جدید پریس - کوئینز روڈ - لاہور
سنِ اشاعت - ۱۹۷۲ء ، صوری کیفیت - چھوٹا سائز ضخامت - تقریباً دو سو صفحات سفید کاغذ - مجلد قیمت - دس روپے

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ چھوٹی قومیں، اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں خود مختار نہیں ہیں ، اور سامراجی طاقتوں نے دنیا کے امن کو برباد کیا ہوا ہے ؛ اس طرح فلسطین، کشمیر اور ویت نام، آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہیں اور اُن کی آزادی کو کچلنے کا بہیمانہ سلسلہ جاری ہے — سقوطِ مشرقی پاکستان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ، زیرِ نظر کتاب اس ہولناک صورتِ حال کی تصویر ہے ۔ خارجی اسباب کے علاوہ سقوطِ مشرقی پاکستان کی بنیادی وجوہات، اپنوں کی سازشیں اور فاش غلطیاں بھی ہیں ۔ اس طرح یہ حادثہ وقتی اور ہنگامی عوامل سے رونما نہیں ہوا ' اس کی جڑیں ہماری قومی زندگی کے ہر موڑ پر موجود دیکھی جا سکتی ہیں ۔ مصنف نے آرزوؤں اور تمناؤں سے بلند ہو کر واقعات کو اس طرح سے دیکھا ہے جس حیثیت سے وہ واقع ہوتے ہیں — خصوصاً مسلم لیگ نے قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد اس ملک کو پارہ پارہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اور اس نے پاکستان کی تاریخ کو سازشوں اور مسلسل استبداد کی تاریخ بنا دیا ہے ۔ جیسے سیاسی اور معاشی استحصال کے ساتھ ساتھ نااہل حکمرانوں کا نئی نسل کی تعلیم و تربیت سے مجرمانہ تغافل اور اغماض بھی موصوف کی نظر میں، سقوطِ مشرقی پاکستان کی اصل وجوہات میں سے ایک ہے — اس طرح یہ کتاب ہماری قومی تاریخ کے ایک بھیانک حادثے کا مجمل سا خاکہ ہے اور اس حادثے کو سیاسی، سماجی اور نظریاتی پس منظر میں دیکھ کر مصنف نے سلیقے سے ترتیب دیا ہے ۔ اس لئے اس کا مطالعہ ہر شخص کی معلومات میں اضافے کا باعث ہو سکتا ہے — موضوع کے ساتھ چونکہ مصنف کا جذباتی تعلق بھی ہے اس لئے بعض مقامات پر جذباتی لب و لہجہ سے مؤرخانہ اسلوب قائم نہیں رہا — خصوصاً " صورتِ حال " کے باب میں یہ کیفیت نمایاں ہے ۔

بہر حال اس موضوع پر سنجیدگی سے جو بھی لکھا جائے گا اس کا مطالعہ یقیناً قاری کے لئے سوچ اور فکر میں کشادگی کا باعث ہو گا — زیرِ نظر کتاب بلاشبہ ایک سنجیدہ کوشش ہے ۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کے جملہ مستخرجہ نتائج سے متفق ہوں ۔

(غلام صابر)

~~~~~~(۰)~~~~~~

۲۔ "اختلاف الفقہاء" (جلد اوّل)

مصنف - امام ابو جعفر احمد بن محمد علی طحاوی - مرتبہ ڈاکٹر صغیر حسن معصومی - شائع کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد -
صفحات - ۳۸۸ - قیمت مجلد - بلیس روپے ۔
~~~~~~

کچھ عرصے کی بات ہے کہ راقم ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی لائبریری میں مصروف مطالعہ تھا۔ دوران مطالعہ عقیقے کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ مسلک نظر کے سامنے آیا۔

حکی صاحب البحر عن ابی حنیفۃ ان العقیقۃ جاھلیۃ محاھا الاسلام۔ (نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۱۴۱)

(ترجمہ) صاحب البحر نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ عقیقہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم ہے جسے اسلام نے مٹا دیا۔

عقیقے کے بارے میں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مسلک میرے لئے ایک نئی اور حیران کن چیز تھی۔ قارئین یہ تو جانتے ہونگے کہ عقیقہ سے مراد وہ مروجہ اسلامی رسم ہے جس کے مطابق صاحب حیثیت مسلمان لڑکے کی پیدائش کے ساتویں دن دو بکرے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بکرے کی قربانی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں امام اعظمؒ کے مسلک پر بڑی سختی سے عمل کرنے کا دعوے کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ طلاق بدعت کو ختم کر دینے کے قانون کی بھی اس لئے مخالفت کی گئی ہے کہ وہ ان حضرات کی "تحقیق" کے مطابق حنفی فقہ کے خلاف تھا (ملاحظہ ہو عائلی قوانین پر چودہ علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۸) لیکن عقیقہ کے بارے میں کسی عالم دین نے امام صاحب کا مذکورہ بالا مسلک کبھی بیان نہیں کیا تھا۔ چنانچہ امام صاحب کی طرف منسوب مذکورہ بالا مسلک پڑھتے ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس بارے میں استفسار کیا۔ فرمانے لگے کہ یہ حوالہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد راقم نے حنفی فقہ کی معتبر کتابوں کو چھان مارا لیکن ان میں امام اعظمؒ صاحب کا مسلک تو کجا بہت سی اہم کتابوں میں سرے سے عقیقے کا ذکر ہی نہیں تھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے زیر نظر کتاب (جسے ادارہ تحقیقات اسلامی کے انہی سربراہ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے جنہوں نے فرمایا تھا کہ یہ حوالہ صحیح معلوم نہیں ہوتا) عقیقہ کے بارے میں حنفی مسلک کو انہی تفاصیل کے ساتھ موجود پایا جو اوپر نیل الاوطار سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی یہ تصریح بھی موجود ہے کہ عقیقہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس پر ابتدائے اسلام میں عمل کیا جاتا تھا لیکن بعد میں عید الاضحےٰ نے اسے منسوخ کر دیا۔ اب یہ ایک اختیاری چیز ہے کسی کا دل چاہے تو اس پر عمل کر لے۔ ویسے یہ کوئی ضروری نہیں۔ (عنوان العقیقہ)

امام طحاویؒ احناف کے معتبر ائمہ میں سے ہیں اور ان کی کتابیں درس نظامی میں بھی داخل ہیں۔ ان کی کتاب زیر تبصرہ ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر معصومی نے مصر سے اس کا مخطوطہ حاصل کر کے بڑی محنت سے اسے زیور طبع سے آراستہ کر دیا ہے جس کے لئے اہل علم کو ان کا مشکور ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کا اسلوب یہ ہے کہ اس میں مختلف مسائل کے ذیل میں نہ صرف ائمہ اربعہ کا مسلک بیان کیا گیا ہے بلکہ بعض ایسے فقہی مذاہب کا مسلک بھی بیان کیا ہے جو باقی نہیں رہے۔ ویسے تو اس عربی کتاب کا مطالعہ تمام اہل علم کے لئے مفید ہوگا۔ لیکن خاص طور پر قدامت پسند علماء کے لئے ناگزیر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ انہیں روشن خیالی کی طرف لے آئے۔ مقام مسرت ہے کہ بڑی مدت کے بعد ادارہ تحقیقات اسلامی کی جانب سے کوئی علمی کتاب سامنے آئی ہے۔

(پروفیسر رفیع اللہ)

―― (۲۴) ――

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

پرویز صاحب کے سلسلۂ معارف القرآن کی ابتدائی کتابوں کے سابقہ ایڈیشن مدت سے ختم ہو چکے تھے اور جویانِ علم و حقائق ان کے لئے بیحد مضطرب۔ للہ الحمد کہ اب ان کے جدید ایڈیشن مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد پھر سے شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب ہے۔

ابلیس و آدم

جس میں دین کے بنیادی تصورات — انسان کی پیدائش اور کائنات میں اس کا مقام۔ قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء۔ ملائکہ کی حقیقت اور ان کا آدم کو سجدہ۔ ابلیس اور شیطان کی اصل اور ان کی اثر انگیزیاں۔ جنات کی حقیقت — وحی کی غایت۔ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے اس کی راہ نمائی کی ضرورت۔ مقامِ نبوت اور منصبِ رسالت جیسے موضوعات کی نہایت بصیرت افروز اور حقائق پرور تشریحات۔ اور اس کے ساتھ اسلوبِ بیان بیحد دلکش اور جاذب۔

قیمت مجلد، گرد پوش۔ **پندرہ** روپے

اور اسی سلسلہ کی دوسری کتاب

جوئے نور

ابھی ابھی تیار ہو کر آئی ہے۔ اس میں تاریخ اور قرآن کا باہمی تعلق، انبیائے سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کی داستانیں بیان کرنے سے مقصد، مارکس کے فلسفۂ تاریخ اور قرآن کے نظریہ میں بنیادی فرق۔ ان تفصیلات کے بعد حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرامؑ اور ان کی قوموں کا تذکرہ۔ ان اقوام کی تباہی کے اسباب اور ان کا ہمارے ساتھ تعلق۔ "عذابِ خداوندی" کا صحیح مفہوم۔ نظریہ قومیت۔ ہجرت۔ معاشی نظام کی قرآنی تشریح۔ ایسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث اور دل نشیں پیرایہ بیان۔ قیمت۔ مجلد۔ گرد پوش۔ **پندرہ** روپے

ملنے کا پتہ:

(۱) مکتبۂ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور ۶ (۲) ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن

(قسط ۲)

مجلسِ مذاکرہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

موضوع:- آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۷)

ایم۔ نذیر خٹک

صدرِ گرامی - معزز خواتین و حضرات

مرزا غالب نے اس شعر میں زمانے سے جو شکایت کی ہے۔ اُس وقت تہذیبِ انسانی اتنے عروج پر نہیں پہنچی تھی جتنی کہ اب ہے۔ اُن کے بعد مغرب کے چند خود غرض اور ناعاقبت اندیش قوتوں نے انسانیت پر مظالم کے جو پہاڑ ڈھائے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ جنگِ عظیم اول کے زخم ابھی مندمل نہیں ہونے پائے تھے کہ بیچاری انسانیت پر دوسری جنگِ عظیم مسلط کی گئی۔ اس جنگ کے نتائج اس قدر بھیانک اور ہولناک تھے کہ حضرتِ انسان کو چار و ناچار اپنی مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ انسانیت کی سلامتی برقرار رکھنے اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے ادارہ اقوامِ متحدہ قائم کیا گیا۔ بظاہر تو یہ ادارہ سسکتی ہوئی انسانیت کے خوابوں کی حسین تعبیر تھا مگر اس کی ہیئتِ ترکیبی کچھ اس طرح طے پائی کہ جہاں چار بڑوں کے مفاد پر زد پڑنے کا اندیشہ پیدا ہوا چھوٹی قوموں کے حقوق پامال کرنے اور اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے بدنامِ زمانہ ویٹو کا استعمال کیا گیا۔ اگر آج مرزا غالب بقیدِ حیات ہوتے اور انسانی حقوق کے تحفظ کے علمبردار اس قدر بڑے ادارے کی یہ حالت دیکھتے کہ یہاں بھی جنگل کا قانون کارفرما ہے۔ تو یقیناً چلا اٹھتے اور پہلے سے بھی زیادہ کرب اور تاسف سے شکایت کرتے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

صدرِ محترم! مرزا غالب کی یہ شکایت محض اُن کے اپنے دور سے متعلق نہیں۔ بلکہ بہ استثنائے معدودے ہر دور کا انسان اس کا شاکی رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کون سے عوامل اور قوی ہیں جنہوں نے آدمی کو انسان بننے سے روکے رکھا ہے۔ قرآن مجید سند ہے اور تاریخ گواہ کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ÷ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

یہ نفسانی خواہشات اور سرکش جذبات آدمی کو انسان بننے کے لئے نہ صرف سدِّ راہ بنتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اُسے حیوانیت کے مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

میرا ایک دیہاتی دوست ہے۔ زمیندار قسم کا آدمی ہے مگر بڑا خوش مزاج، مخلص اور سلجھا ہوا۔ ایک دن میں اُس کے ہاں چلا گیا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد ہل اپنے کندھے پر لٹکائے اور بیلوں کو ہانکتے ہوئے وہ کھیت سے آپہنچا۔ سلام کلام کے بعد وہ اپنے بیلوں کو چارہ ڈالنے لگا۔ میں نے ویسے ہی کہا۔ "کیوں بھئی! ان بیلوں کو ایک دوسرے سے ذرا دور باندھو تاکہ یہ چارہ ان کے لئے باعث تنازعہ نہ بنے۔" وہ کہنے لگا "نہیں دوست! یہ انسان تھوڑے ہیں۔ یہ تو انسانوں کا شیوہ ہے، جو نہ صرف دوسروں کا حق مارتے ہیں بلکہ زائد از ضرورت چارہ ذخیرہ کر دیتے ہیں۔ حیوانات تو اِس معاملے میں ہم انسانوں سے زیادہ مشرف ہیں۔ جو جیسے بقدرِ ضرورت کھا کر باقی دیگر حیوانات کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ مسرف نہیں ہیں۔ ایک حیوان کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔ جو فرض سونپا جائے پوری تندہی سے سرانجام دے کے رہیگا۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں دیکھئے ظلم کی کونسی حد ہے جو یہاں نہیں پائی جاتی۔ حق تلفی، ذخیرہ اندوزی، دھوکا دہی، بردہ فروشی، غنڈہ گردی اور خونریزی انسانی زندگی کے معمول بن چکے ہیں۔ کیا انسانوں کی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے جو میری بیوہ بہن سے ہوا ہے۔ چند درندہ صفت انسانوں نے اس کے اکلوتے اور معصوم لختِ جگر کو محض اس لئے گولیوں سے چھلنی کر دیا کہ جائیداد کا کوئی وارث نہ رہے؟" اس کے بعد اس نے کہا "اگر مجھے موقعہ مل جائے تو میں ہر انسان سے اس کا انتقام لوں گا۔ اپنی بہن کی دلدوز چیخیں اُس وقت تک میرے دماغ میں گونجتی رہیں گی جب تک انسانی خون سے میں اپنی پیاس نہ بجھاؤں۔ مجھے انسانی دنیا سے گھن آنے لگی ہے۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔"

اگر میں مداخلت نہ کرتا تو نہ جانے کب تک وہ ابنِ آدم سے بیزاری کی شکایت کرتا رہتا۔ اُس وقت تو تسلی دے کر وقتی طور پر میں اُس کے جذبات کو کسی حد تک معمول پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس نے زبانِ حال سے بتا دیا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

اُس کے ساتھ مزید بات چیت سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میرے اس دوست کا ضمیر انسان کی چیرہ دستیوں سے اس قدر مجروح ہو چکا ہے کہ اگر اس کا بروقت مداوا نہ کیا گیا تو بعید نہیں کہ وہ کسی غیر معمولی واقعہ کا مرتکب ہو جائے۔ چنانچہ اس کا تذکرہ میں نے نمائندہ بزم سے کیا اور اُن کے مشورے کے مطابق اُسے نہ صرف ماہنامہ طلوعِ اسلام باقاعدہ جاری کیا بلکہ ادارے کی دوسری مطبوعات بھی دیتا رہا۔ اب اس کے زاویہ نگاہ اور اندازِ فکر میں کافی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ چند روز قبل اُن سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "بھئی! بمصداق کسے۔ اگر آپ نے مجھے مکمل گمراہ نہیں کیا تو کم از کم ڈانواں ڈول ضرور کر دیا ہے۔"

صاحبِ صدر! ہاں تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آدمی کو اس کی نفسانی خواہشات اور سرکش جذبات انسان بننے نہیں دیتے مگر زمانہ کی ریگِ رواں پر ایسے لوگوں کے پیروں کے نقوش بھی جگمگ جگمگ کر رہے ہیں جنہوں نے ایک ایسے جنت نظیر معاشرے کی بنیاد ڈالی جس میں ہر شخص کو انسان ہونا میسر ہو۔ آج سے چودہ سو برس قبل جب کرۂ ارض کے ہر گوشہ میں انسانیت کی کھیتی خشک ہو چکی تھی۔ ہر طرف جاہلیت، مکر و فریب، ظلم و تشدد، وحشت و بربریت اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا، وادیٔ فاران کی چوٹیوں پر ابرِ رحمت نمودار ہوا۔ اور یوں برسا کہ انسانیت کی اُجڑی کھیتی سرسبز و شاداب بن کر لہلہانے لگی۔ آبیاریٔ وحی کے بعد اس کشتِ ویراں میں ایسے ایسے پھول کھلے جن کی مہک چار دانگِ عالم میں پھیل گئی۔ وہ بدو جو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ تھے عروسِ تمدن کے چہرے پر زیبائشی خال بن گئے۔ ریگزارِ عرب میں ایک

اپنے معاشرے کی بنیاد رکھی جس پر اہلِ جنت کو رشک آیا جسے دیکھ کر ملائکہ سجدۂ احترام میں گر پڑے کیونکہ یہ انسان تو يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ کی تردید کر رہے تھے۔ مگر پھر کیا ہوا۔ انسانیت کے ازلی دشمن سازش کرنے میں کامیاب ہو گئے سرمایہ دار نے وسائل رزق پر قبضہ کر کے انسان کو اپنا دست نگر بنا دیا۔ مذہبی پیشوائیت نے انسانی ذہن میں وہ کیل ٹھونکے جس سے اس کی سوجھ بوجھ کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ اور یوں ان دونوں کی ملی بھگت سے ملوکیت نے ظل اللہ اور ظلِ سبحانی بن کر انسانیت کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا دیا اور وہ ضربیں لگائیں جس سے انسانیت کے پرخچے ہوا میں اڑ گئے۔ انسانیت کو ظلم و ستم کی اس چکی میں پستے ہوئے دیکھ کر مرزا غالب چیخ اٹھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

صدر عالی وقار! اس گٹھ جوڑ کا لازمی ردِعمل ہوا کہ دنیا کی بیشتر اقوام وحیِ خداوندی کی صداقت کے متعلق شک میں پڑ گئیں اور بعض اقوام تو جوشِ انتقام میں اس قدر آگے بڑھ گئیں کہ لادینی فلسفے کی بنیاد پر اپنے لئے الگ نظام وضع کر لئے۔ یہ نظام وقتی چمک کی وجہ سے وجہ کشش ضرور بن گئے لیکن

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

کیونکہ یہ عمارت جس فلسفے کی بنیاد پر کھڑی کر دی گئی ہے وہ غیر مستحکم ہے۔ اس میں طویل عرصہ کے لئے اتنا بھاری بوجھ اٹھائے رکھنے کی استعداد نہیں۔ تجربات نے ثابت کر دیا کہ روس کا اشتراکی نظام ناکام ہو چکا ہے۔

صدر عالی مرتبت! انسان کا یہ تاریک مستقبل دیکھ کر ہندوستان کے ایک نابغہ اور درویشانہ صفت حکیم نے آواز اٹھائی کہ مغربی جمہوریت یا مارکسی اشتراکیت انسان کو فردوسِ گم گشتہ واپس نہیں دے سکتا بلکہ یہ ہر دو نظام انسانی کی مزید تباہی و بربادی کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی ٭ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

انہوں نے ایک خواب میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت کے خطوط کھینچے جو دکھی انسانیت کے لئے گوشۂ تسکین ثابت ہو۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ کا آفتابِ حیات تو غروب ہو گیا مگر اسلام طلوع ہوا۔ حبیبِ رسولؐ کا ایک سپاہی آگے بڑھا جس نے ہلالی پرچم اپنے ہاتھوں میں تھام کر ہندو اور انگریز کے سیاسی مہروں کی بساط الٹ دی۔ ادھر ایک مردِ قلندر نے اپنے اخلاص، یقینِ محکم اور زورِ قلم سے مذہبی پیشوائیت کی دھجیاں بکھیر دیں۔ خوابِ اقبالؒ نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ پاکستان بن گیا مگر پاکستان بننا تو مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ تو محض ذریعہ تھا ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے حصول کا۔ پاکستان حاصل اس لئے کیا گیا تھا کہ اس میں قرآنی خطوط پر ایک ایسے مثالی معاشرے کو تشکیل دیا جائے جس کے حسین نتائج دیکھ کر دنیا کے دیگر اقوام از خود اسے نافذ کرنا چاہیں اور اس طرح نہ صرف پاکستان میں بلکہ ساری دنیا میں ہر آدمی کو انسان بننے کے مواقع میسر آ سکیں۔ مگر یہاں کیا ہوا۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کچھ ایسی غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس سے سالمیتِ پاکستان خود خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وقت آ چکا ہے کہ اہلِ فکر اور اہلِ قلم طبقہ قومی یکجہتی اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں وقف کر دیں۔ خدانخواستہ اگر دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو گیا تو موجودہ پاکستان جو ہمارے لئے امید کی موہوم سی کرن ہے (خاکم بدہن) مٹ جائیگا اور پھر نہ جانے کتنے زمانوں تک غالب کی روح بے قراری سے گنگناتی جائے گی کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

مگر نہیں صاحب صدر! جو نوجوان طلوعِ سحر کے آثار کی نشاندہی کر سکتا ہو، اپنے کردار کی پختگی اور حوصلے کی بلندی سے سنگِ گراں کاٹ کر جوئے شیر لانے کا عزم رکھتا ہو، اور مزید برآں 'تیرا مسلمان کدھر جائے' کی شکایت سے بے نیاز ہو کر اپنے سامنے ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین رکھتا ہو، اُس کے لئے ناممکن نہیں کہ وہ سرحداتِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کا تحفظ کر کے لا الٰہ الا اللہ کا اضافہ کرے اور یوں ایک ایسا معاشرہ وجود میں لائے جس میں یہ شکایت ہی نہ ہو کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۸)

نوشابہ سبحانی

نوعِ انسان کی عبرتناک تاریخ اور اُس کی اندوہناک محرومیوں کی دلخراش داستان بڑی خوبی سے اِس مصرعے میں سمو دی گئی ہے۔ آج کے اِس تاریک لمحے جب ہم تاریخ کے بے رحم شکنجے میں جکڑے جا رہے ہیں مناسب ہوگا کہ شاعر کی اِس دلدوز چیخ کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ کہا یہ گیا ہے کہ آدمی جس کی تخلیق اور مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا نقطۂ ماسکہ شرفِ انسانیت کی تکمیل تھا، وہ اپنی منزل سے قطعاً بے بہرہ ہے لہٰذا انتہائی خسارہ میں اور محرومی و مردودی ہے۔

معزز حاضرین! یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ خدائے بلند و برتر نے جب اِس روئے زمین پر انسان کی تخلیق کی تو اُس کی نشوونما اور تکمیلِ ذات کے لئے اُسے دیگر مخلوقات کو اپنے زیرِ نگیں کرنے کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال کر دیا تاکہ وہ ارض و سما کے پوشیدہ ذخائر کو دریافت کر کے اپنے تصرف میں لا سکے۔ ساتھ ہی مستقل اخلاقی (انسانی) اقدار سے بھی روشناس کروا دیا تاکہ ماحصلِ تگ و تاز کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر سکے مگر دیگر مخلوقات کی طرح انسان کو اس رہنمائی پر کاربند رہنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا گیا کیونکہ یہ شرفِ انسانیت کے منصبِ جلیلہ کی توہین ہوتی جو قادرِ مطلق کو منظور نہ تھی بلکہ حضرتِ انسان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ چاہے تو اِس رہنمائی کو مشعلِ راہ بنا کر فلاح و سعادت کی راہیں کشادہ کرے اور چاہے اس سے سرکشی اختیار کر کے قعرِ مذلت میں غرق ہونا اپنا مقدر بنا لے۔ صحیح عظمت اور شرفِ انسانیت کی تکمیل کا راز آزادیٔ فکر و عمل میں پوشیدہ رکھا گیا ہے جبری اطاعت میں ہرگز نہیں اور یہی انسان کا طرۂ امتیاز ہے وگرنہ ۔۔۔ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں!

آخر خیر و شر کے راستوں کو اپنی مرضی سے اختیار کر لینے والی ہستی کی تخلیق کی ضرورت کیا تھی! یقیناً کسی عظیم منصوبہ کی تکمیل کی ایک اہم کڑی کے طور پر اِن خصوصیات کے ساتھ اس کی تخلیق عمل میں لائی گئی اور اِس کی رہنمائی کے لئے خالقِ کائنات نے اپنے برگزیدہ بندوں کی وساطت سے وحی کا سلسلہ قائم کیا تاکہ زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

اِس عظیم اہتمام کے ساتھ رب العزت نے روئے زمین پر شرفِ انسانیت کی قندیل روشن کرنے کے لئے آدمی کو بھیجا۔ لیکن اِس نے یہاں آ کر کیا گُل کھلائے! اس نے اپنے اختیار کے غلط استعمال سے ہوس پرستی اور بدکرداری کی تباہ کن روش اختیار کی اور یوں انسانیت کی منزل سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس نے خدا کے اُس عظیم اعتماد کو بھی فراموش کر دیا جس کی بنا پر اُسے

مسجودِ ملائک بنایا گیا تھا۔ بدبخت اپنے نصب العین سے منحرف ہو کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور اس کے ماحصل کو وقفِ رفاہِ عام کرنے کی بجائے تحت الثریٰ کی پستیوں میں رینگنے میں ہی محو ہو گیا۔ کس قدر جاہل اور ظالم ہے یہ انسان!

اسی شکست خوردگی کی ہولناکیوں سے تاریخ انسانیت اٹی پڑی ہے۔ تاریخ نے انہی انسانوں کو انسانوں کا گلا کاٹتے دیکھا۔ تاریخ نے انہیں دوسروں کے حقوق غصب کرتے دیکھا۔ تاریخ نے انسانوں کو روٹی کے نوالے اور زمین کے ٹکڑے کیلئے کتوں کی طرح غراتے دیکھا۔ تاریخ نے انکی ہوس پرستی کے ہاتھوں سلطنتوں کو تاراج ہوتے دیکھا۔ المختصر انسان کی مٹی پلید ہوتی رہی، خون بہتا رہا اور شیطانی قوتیں وحشیانہ قہقہے لگاتی رہیں۔ جبھی تو مرزا غالب کو کہنا پڑا کہ آدمی جس کی سرشت میں ہی انسان بنا رکھ دیا گیا تھا جب اُسے وہی بننے کی توفیق نہیں ہوئی تو پھر اس سے اور کیا تمنا کی جا سکتی ہے۔ لیکن حضرتِ انسان کی خودسری دیکھئے جو پوری ڈھٹائی سے دعویدار ہیں کہ ہم وہ ہیں جنہوں نے سائنسی رموز کو واشگاف کیا۔ کائنات کی حقیقتوں سے پردے اٹھا کر انہیں مسخر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان عظیم کامیابیوں کے شاہکار ایٹم اور ہائیڈروجن بم ہیں جو انسانیت ہی کا گلا گھونٹنے کا باعث ہوئے! چنانچہ انسان کی انہی وحشیانہ قہقہوں پر انسانیت کے نام نہاد علمبردار مسلمانوں کے عظیم مفکر کو یوں طنز کرنی پڑی

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ⁂ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اور وہ جنہیں زعم تھا اپنے افکارِ عالی پر، افکار ہی کی دنیا میں محوِ سفر رہے۔ زمانے کی آنکھ نے کہا اب دیکھئے پردۂ افکار سے کیا ظاہر ہوتا ہے معلوم ہوا فکر و تدبر کے لئے سکونِ دل چاہیئے سکونِ دل کے لئے عیش و آرام کی زندگی۔ سوسائٹی نے کہا دیجئے جو چاہتے ہیں ہمارے مفکرین اور ادبا۔ شاید یہ اس سفر سے ہمارے لئے کوئی ایسا گوہرِ گراں مایہ نکال لائیں جو ہمیں انسانیت کی منزل سے ہمکنار کر سکے لیکن ان کا یہ سفر نہ کبھی ختم ہونا تھا نہ ہوا۔ اور یہ افکار کی دنیا میں سفر کرتے کرتے حقائق کی دنیا سے روپوش ہو گئے اور انکے ماحصلِ فکر کا صبر آزما انتظار اُس ڈراؤنی رات پر اختتام پذیر ہوا جب وہ سرزمین بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی جس پر انسانیت ساز معاشرہ استوار کرنا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آج وہ کہانی ایک زندہ حقیقت بن گئی ہے جو ہم بچپن میں پڑھا کرتے تھے کہ ایک شیخ چلی کے ہاتھ چار پیسے مفت آ گئے تو وہ شیشے کے برتن خرید کر بیچنے بیٹھا اور سوچ ہی سوچ میں نہ جانے کیا کیا سبز باغ تعمیر کرنے میں گم ہو گیا اور انجام کار اُسکی بیفکری پر واز برتنوں کے ٹکڑوں پر ختم ہوئی۔ ایسی ہی بلند پروازی کچھ ہمارے مفکرین و مدبرین کا شیوہ رہی ہے جو پاکستان کے ٹکڑوں پر منتج ہوئی۔ جب افکار کے سفر یوں موت کی وادیوں میں ختم ہوں، تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ دوزخ میں ڈال دے کوئی ان کتابوں کو جنہوں نے آج کی جوان نسل پر فلاح و سعادت کے لئے تڑپ کر سرگرمِ عمل ہونے کی راہ مسدود کر دی ہے۔ آج کی جوان نسل امریکہ، روس اور بھارت کے قدموں پر لوٹتی ہوئی ذلت آمیز زندگی ہمیں بخشنے والوں سے پوچھتی ہے کہ فکر کے وہ چراغ جو ایک صدی سے اس سرزمین پر روشن کئے جاتے رہے ہیں اس المناک رات کی تاریکیوں کو مٹانے میں کیوں ناکام رہے ہیں؛ شاید اس لئے کہ ہماری یہ فکر وہ پُرسکون سمندر نہیں تھا جس میں غوطہ زن ہو کر ہم گوہرِ مقصود حاصل کر لیتے۔ بلکہ یہ بپھرے ہوئے طوفان کی وہ موجیں تھیں جن کی زد میں آ کر شاہین کے پر بھی ٹوٹ گئے۔ اس کا ذوقِ پرواز چھن گیا۔ اُس کی قوتِ عمل مفلوج ہو گئی۔ اسی لئے تو خالقِ کائنات کی واضح تنذیر کو ہر لمحہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت تھی کہ افراط و تفریط سے بچو۔ افراطِ فکر اور تفریطِ عمل کا انجام ایسا ہی المناک ہوتا ہے جو ایک تلخ حقیقت بن کر ہماری تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ وہ حقیقت جو اٹل ہے، جو حیلہ بازیوں سے جھٹلائی نہیں جا سکتی اور نہ الزام تراشیوں سے مٹائی جا سکتی ہے۔

یہ تلخ حقیقت ہماری انفرادی و اجتماعی بے عملی اور ہماری بے حسی کا آئینہ ہے۔ یہ تاریخ کا وہ عبرتناک فیصلہ ہے جس کے پیچھے پچیس سال کی بے عملیوں کی داستان ہے۔ گمراہی کی وہ کہانی جس کا الزام کبھی سیاستدانوں کو قرار دیا جاتا ہے کبھی زعمائے حکومت کو، کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو۔ درحقیقت پوری قوم کے اجتماعی کردار کے دیوالیہ پن کی عبرتناک کہانی ہے۔ قول و فعل کے اس تضاد کی کہانی ہے جسے خالقِ کائنات نے منافقت کا نام دیا ہے۔ اور یہ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ منافق کا حشر قرآن کی میزان میں کافر سے کہیں زیادہ عبرتناک ہوگا۔ اور جب ایک پوری کی پوری قوم منافقانہ روشِ زندگی کی عادی ہو چکی ہو تو معزز حاضرین آپ خود ہی اندازہ فرما لیجیے کہ اتنی فاش اجتماعی غلطی کا انجام کیا ہو سکتا ہے!

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے ✦ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

قطعاً یہی تو کہا ہے کہ یہی غیر ایماندارانہ روش جس سے انسانیت کی اساس ہی مجروح ہو جاتی ہے کیونکر قابلِ معافی قرار دی جا سکتی ہے! چنانچہ مکافاتِ عمل کے ہاتھوں ہم اس ذلت آمیز انجام کو پہنچے ہیں۔ کس قدر عبرتناک سانحہ ہے کہ رہنمائی کے عظیم سرچشمے قرآن پاک کی دلدادہ قوم کا انجام اس قدر عبرتناک ہو۔ یہ کیونکر ہوا؟ صرف اس لئے کہ فلسفیانہ تشریحات و توجیہات اور علمی موشگافیوں کے بھنور میں پھنس کر ہم شہادت گہِ الفت کے تقاضوں سے منحرف ہو گئے ہیں اور ہجرت فی سبیل اللہ پر تکیہ کر لیا ہے۔

فلسفہ اور علم و حکمت کا حصول فی زمانہ کوئی دشوار مسئلہ نہیں بلکہ آج کی سوسائٹی کے لئے تو یہ فیشن بن گیا ہے لیکن اس علم کو جب عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کا وقت آتا ہے، جب عمل کے سانچوں میں ڈھلنے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے، جب علم کی روشنیوں سے قلب کو منور کرنے کا لمحہ آتا ہے اور جب عملی میدان کے خارزار میں تشکیلِ معاشرہ کے لئے جگر پاش مشقتوں کی گھڑی آتی ہے تو علم کی شمع کے یہ پروانے علم و حکمت کے انبار کی اوٹ میں منہ چھپائے پھرتے ہیں تاکہ ان کے چہروں پر لگی ہوئی بے عملی کی کالک کسی کو نظر نہ آ جائے۔ وہ بڑی دردمندی سے "تلاشِ انسانیت اور فلسفۂ اخلاق" پر بڑی دلگداز تقریریں کرتے ہیں تاکہ ہوس پرستی اور مفادِ عاجلہ کے پیچھے ان کی مجنونانہ دوڑ پر احتجاج کرنے والی زبانیں گنگ کی جا سکیں۔ لیکن آج اس دوہری پالیسی اور اس منافقانہ روش کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ بغض و عداوت کے انتشار نے ان ہوس پرستوں کے نقاب بھی جلا ڈالے ہیں جنہوں نے کہیں مولویوں کا روپ دھارا، کہیں اسلام پسندی کے منافقانہ دعووں کی آڑ میں مستقل اقتدار کا استحصال کرتے رہے، کہیں شاندار کوٹھیوں میں نرم صوفوں پر بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر لیکچر دیتے رہے اور کہیں غمخوارئ انسانیت کا بہروپ بھرے اظہارِ کاتبِ تقدیر کی محفلیں گرماتے رہے۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف روپ ہیں جن کا گھناؤنا پن یکساں طور پر واضح ہے۔ یہ تلخ حقیقت تو منافقت ہے یا بے عملی کہہ لیجیے اور یہ منافقین فلسفۂ اخلاق و انسانیت کو کتابوں اور تقریروں کے قلعے میں بند کر کے اُن سے اپنی مفاد پرستانہ سرگرمیوں کے لئے دفاعی حصار کا کام لیتے ہیں۔ مفاد پرستی کی اس دوڑ میں یہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خالقِ کائنات نے ہمیں فلاح و سعادت کی کس راہ کا سراغ دیا تھا وہ یہ راہ تھی۔ معزز حاضرین! فرمانِ خداوندی ہے کہ "تم منہ سے وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں" محض اس ایک فرمان نے مسلمانوں کے لئے بے عملی اور منافقت کی زندگی کا تصور ہی ختم کر دیا تھا مگر ہم اس گوہرِ مقصود کو اپنے مجرمانہ تغافل سے گنوا بیٹھے ہیں۔ ہم اس حکمت اللہ کو بھی بھول گئے ہیں جو ایک جلیل القدر بزرگ ہستی کے ایک بچے کو گڑ کھانے سے منع نہ کرنے میں پنہاں تھی کیونکہ خود گڑ کھاتے ہوتے۔ ایسی کیفیت میں ایسی تنبیہ منافقانہ ہوتی لہٰذا بے اثر ہوتی ہے۔ غور فرمایا آپ نے حاضرین! اس کے برعکس ہمارا معاملہ کچھ یوں ہے کہ زر و مال کے ڈھیر پر بیٹھ کر قناعت کا درس دیتے ہیں۔ چوہوں کی طرح بلوں میں دبک کر بہادری کا راگ الاپتے ہیں۔ اس پر شکوہ ہے کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔ کیا یہی ہوتے ہیں باوقار قوموں کے زندہ رہنے کے انداز؟ کیا یہی اطوار ہیں

عرب کے سنگ زاروں سے اٹھنے والے اُن مردانِ حق کے جنہوں نے کائنات کے گوشے گوشے میں اسلام کی سربلندی کے پرچم لہرا دیئے، جن کی عظمتوں کے سامنے اُس وقت کی عظیم ترین تہذیبیں سرنگوں ہو گئیں۔ حضرات! اُن لوگوں کا شعار تو یہ تھا کہ چند کلمات خداوندی سننے کے بعد کہتے تھے، ذرا توقف فرمایئے یا رسول اللہ! ہم ان پر عمل کر لیں پھر آگے چلیں گے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ فکرِ قرآنی کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور پھیلانے میں زندگیاں صرف کر ڈالتے ہیں مگر عمل کی لذت سے آشنا نہیں ہو پاتے۔ اسی لئے ہمارے مذاکرے، مناظرے اور مجرد غور و فکر اس سلسلہ کو تحت الثریٰ میں گرنے سے نہیں بچا سکے۔ ہماری فلاح تو جہدِ مسلسل کی دقتوں اور دشوار گزار راہ اختیار کرنے میں مضمر تھی جس پر چل کر ہمارے آباؤ اجداد نے تاریخ میں کتنے ہی ابواب کا اضافہ کیا۔ اس لئے نہ اسلام کی تعلیم میں تقسیم توانائی ہرگز خالقِ کائنات کا مدعا ہوا نہیں کرتی بلکہ اس کی راہنمائی میں تمام انسانی قوتوں کو یکجا بروئے کار دیکھنا منشائے خداوندی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "جو اپنے معاملات کے فیصلے ہمارے رہنما اصولوں کے مطابق نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔" اس ارشادِ باری کی روشنی میں ہم اپنی کرتوتوں کے باعث مسلمان کہلانے کے بھی حقدار نہیں رہے۔ کیا اسکے حضور ہمیں رحم و رعایت کی درخواست گزارنے کا منہ ہو! ہم سے تو سرحد کے اُس پار بسنے والے وہ نام نہاد منکرینِ خدا ہی بہتر ہیں جو اخوت، مساوات، سماجی انصاف اور احترامِ آدمیت کے خدائی قوانین کی رہنمائی میں ہمہ تن مصروف بعمل ہیں اور دنیا کی توجہ کا مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ ہم تو فلسفۂ اخلاق پر ورق سیاہ کر سکتے ہیں لیکن اس دل سے خود آگاہ سے محروم ہیں جس پر اس فلسفے کی حکمرانی ہو۔ اسلام کی عظمتِ رفتہ کی حمایت میں بھاٹوں کی طرح چیختا چلانا سستی شہرت کا باعث تو ہو سکتا ہے لیکن زندگی کا دامن ان داغوں سے پاک کرنا محض جذبہ ہمدردی سے ہی ممکن ہے۔ ہم اسلام اسلام کا ڈھنڈورا تو پیٹ سکتے ہیں لیکن سنتِ رسول اللہ کی پیروی میں دوسروں کی بھلائی کی خاطر فقر و افلاس، سپاہیانہ اور سادگی کی زندگی اختیار کرنے اور مالی و جانی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہنے کا ہم میں حوصلہ نہیں کیونکہ —— یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے —— اور ہم نے باتیں بنانے میں ہی —— آسان سمجھ رکھا ہے مسلمان ہونا —— لیکن یقین کیجئے سچائی اور فتحمندی کا راستہ پرمشقت عملِ پیہم کا متقاضی ہے۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دس برس کی قلیل مدنی زندگی میں تقریباً اسی چھوٹی بڑی جنگیں لڑیں۔ اس لئے کلمۃ الحق کی سربلندی کے لئے ہمہ وقت جہاد کرنا یا جہاد کی تیاری میں مصروف رہنا سنت ہے۔ بڑے سے بڑے خطرے میں بھی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنا اور پیٹھ نہ دکھانا سنت ہے اور دشمن سے ہوشیار رہنا اور فریب نہ کھانا بھی سنت ہے کیونکہ غفلت اور کاہلی کی سزا غلامی کا جہنم ہے جس کی ابتداء ۹۰ ہزار سپاہ کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کی سرزمین پر ہو چکی ہے۔ اب بھی تاریخ کے فیصلے سے سبق نہ لیا گیا تو

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اللہ کے بندو[۱]
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اگر بہ الفاظ دیگر محض خالی خولی علم سے انسانیت کی منزلِ مراد بھی حاصل ہو سکتی تو آج ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے یقیناً انسانیت کی معراج پر فائز ہوتے لیکن یہاں وہ بھی حیوانیت کی پستیوں میں گم ہیں۔ خدائی احکامات کی تشریح و توجیہہ اور تفسیر میں ساری اسلامی دنیا پر سبقت لے جانے والے زرخیز دماغوں کی یہ سرزمین تاریخ کے افق پر درخشاں ستارے کی طرح چمکنے کی بجائے تاریخ کے سب سے زیادہ الم انگیز حادثے سے کیونکر دوچار ہوتی؟ اس لئے کہ مسلسل بے عملی اور تن آسانی نے ہماری غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے احساس کو پامال کر دیا ہے۔ نتیجۃً تاریخ نے ہمارے منہ پر وہ زناٹے کا طمانچہ رسید کیا ہے کہ اس کی گونج چار دانگِ عالم

---

۱ میری مراد نام نہاد ہندو دانشوروں سے ہے ورنہ اللہ کے بندوں کو کون مٹا سکتا ہے وہ تو خود ملکوں کو حیاتِ نو سے ہمکنار کرتے ہیں۔

میں پھیل گئی ہے۔ وقت کی لگام ہمارے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ اس لئے بے مقصد باتوں کا یہ سلسلہ اب ختم ہونا چاہیئے۔ اگر قوم باوقار زندگی کی لذت سے محروم ہی نہیں ہو چکی، اگر مردہ احساس اور جاں بلب حمیت میں کوئی بھی چنگاری باقی رہ گئی ہے تو یاد رکھیئے فلاح و سعادت کا ایک ہی راستہ باقی ہے کہ سر پر کفن باندھ کر اپنے لٹائے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑیں۔ آج اِس مٹتی ہوئی قوم کی آخری سسکیاں اُن مردانِ خود آگاہ کو پکارتی ہیں جنہیں شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنے کا حوصلہ ہے جو عمل کی ضربِ کلیمی سے غفلت و کاہلی کی تباہ کاریوں کے سیلابوں کا رُخ موڑ سکیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے عرصہ دراز ہوا فرمایا تھا۔

> صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
> لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اور یہی راز اگر آج بھی ہم پر آشکارا ہو جائے تو آدمی کا انسان بننا تو کیا قادرِ مطلق کے رفیع ادنیٰ نیچے کے فرشتے بھی بہرہ در ہو سکتے ہیں

> ..... سے ..... مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

خداوند کریم اس احساسِ زیاں سے ہماری راتوں کی نیند اور دنوں کا چین حرام کر دے، زندگی جاننے لئے وبالِ دوش بن جائے تو شاید حیاتِ بے شرف کی ذلت ہم میں موتِ باشرف کی عظمت قائم کرنے کی تڑپ پیدا کرے!

---

(۱۰)

کوکی

میرے بزرگو! میری تقریر صرف ایک فقرہ کی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔

سڑک پر ایک بچی جا رہا تھا..... اُدھر سے آواز آئی۔

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔"

والسلام

---

(۱۱)

تنویر جہاں

محترم بابا جی! اور قابلِ صد احترام بزرگانِ کرام! ایک عرصہ سے میری آرزو تھی کہ میں بھی کبھی طلوعِ اسلام کنونشن کی پاکیزہ شگفتہ اور پُر وقار تقریب میں حصہ لوں۔ آج بفضلِ خدا مجھے یہاں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے اس کے لئے میں اپنے محترم و شفیق بابا جی کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی اس ناچیز بیٹی کو اس بزم میں حصہ لینے کے قابل سمجھا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ سب سے زیادہ مسرت اور طمانیت مجھ کو اس لئے ہو رہی ہے کہ پہلے میں بابا جی کے یہ گراں قدر الفاظ صرف پڑھا کرتی تھی لیکن اب اس کا تجربہ بھی ہو گیا ہے کہ "کس قدر وجہِ شادابی فکر و سیرابی جذبات ہوتے ہیں وہ اجتماعات جن کے شرکائے محفل میں کامل ہم آہنگی قلب و نگاہ اور یک رنگی تصور و خیال ہو اور پھر جب اس یک رنگی و ہم نظری کی بنیاد خدائے عظیم کی کتابِ جلیل و جمیل کی عطا کردہ بصیرت ہو تو اس محفل کے دامان باغبان و کفِ گلفروش ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے؟"

معزز سامعین! چونکہ اس بزم کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مضطرب اور بیقرار اذہان و قلوب کو اپنے دلی جذبات و احساسات کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے تو اس وقت میرا دل بے اختیار اس بات کا تقاضا کر رہا ہے۔ تمہیداً یہ بھی

عرض کرتی چلوں کہ پہلے پہل مجھ کو "طلوع اسلام" سے متعارف ہونے کا شرف کس طرح حاصل ہوا۔ کیونکہ یہی تعارف میرے یہاں حاضر ہونے کا محرک بنا ہے اور میری زندگی میں ایک عظیم انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

چار سال پہلے جب میں راولپنڈی کے ایک کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی تو مذہب کی فرسودہ اور بے روح رسوم و روایات اور اسلام کے مبلغ علماء کے فکر و عمل میں تضاد کی وجہ سے ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ جو شکوک و شبہات اسلام کے بارے میں میرے ذہن میں پیدا ہو چکے تھے جب ان کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا تو بالآخر میں نے مذہبی قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا ہی چھوڑ دیا جس سے ذہن میں مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ لہٰذا جو بھی اسلامی رسالے کتابیں وغیرہ کالج لائبریری میں ہوتیں میں ان کو یکسر نظر انداز کر دیا کرتی تھی حتیٰ کہ ایک روز حسب معمول نوٹس تیار کرنے کے لئے لائبریری گئی تو جس میز پر میں نے اپنی کتابیں رکھیں وہاں چند رسالے بھی موجود تھے جن میں "ترجمان القرآن" اور "طلوع اسلام" نمایاں تھے جن کو مذہبی قسم کے سمجھ کر میں کھول کر بھی نہیں دیکھتی تھی لیکن اس وقت اچانک میری نظر طلوع اسلام کے ٹائیٹل پر لکھے ہوئے ایک جملہ پر مرکوز ہو گئی جو کسی کے ذہن کی عکاسی کر رہا تھا۔ لکھا تھا "اس رسالہ کو ہرگز نہ پڑھیں اس میں صرف زہر ہی زہر بھرا ہے" چونکہ میں نے یہ جملہ پڑھا میرے ذوق تجسس نے اس "زہر" کا ذائقہ چکھنے پر اشتیاق دلایا اور جیسے ہی میں نے اس "زہر" کو چکھا اس نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ آخرکار میرا "انتقال" ہو گیا یعنی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چونکہ جان بوجھ کر زہر کھایا تھا اس لئے مذہب کی عدالت میں یہ خودکشی ثابت ہوئی جس کی سزا یوں ملی کہ میری روح اختلافات، جھڑکیوں، طعن و تشنیع، غلط اور گمراہ کن عقائد و نظریات کی کشمکش، اضطراب اور نظام ربوبیت کی جنت کی تلاش میں جہاں انسانیت کا دور دورہ ہو سرگرداں کے عالم برزخ میں معلق ہے اور اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے میں اسی جنت میں آ گئی ہوں۔ بفضل خدا اب تمام رفقائے سفر کے سامنے ایک اعلیٰ اور بلند ترین نصب العین حیات جس سے بہتر انسانیت کے بلند مقام تک پہنچنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

میرے بزرگو! طلوع اسلام کے "زہر" نے مجھ پر گذشتہ چار سال سے خاص طور پر یہ تلخ حقیقت پوری طرح واضح کر دی کہ واقعی "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" اس لئے کہ جب دین اپنی اصلی شکل سے تبدیل ہو کر مذہب کی سطح تک پہنچ گیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت بھی اپنے مقام سے گرتے گرتے آدمیت کی سطح تک پہنچ جاتی ہے اور جب انسانیت کی تشکیل کا واحد ذریعہ یعنی قرآنی اقدار یا نظام ربوبیت ہی موجود نہ ہو تو بے چارہ آدمی کن ذرائع سے شرف انسانیت حاصل کر سکتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

پروفیسر جوڈ نے یورپ کے نوجوان کے بارے میں کہا ہے کہ "یہ نوجوان شاہراہ حیات پر بے مقصد چلا جا رہا ہے اسے کچھ خبر نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے۔ نہ اس کا کوئی عقیدہ ہے نہ ضابطہ حیات، نہ معیار نہ اقدار"۔

جناب صدر! یہ تو اس قوم کے نوجوان کی حالت ہے جس کے پاس زندگی کا سفر طے کرنے کے لئے "انسانی عقل" کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں ہے لیکن مقام حیرت تو یہ ہے کہ وہ قوم جس کے پاس انسانیت ساز اقدار کا مجموعہ موجود ہے اور جس کو مخاطب کر کے قرآن نے کہا تھا کہ — كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اس کے نوجوان کی حالت بہتر

تو کیا اور بھی گئی گزری اور بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ آج اسکی حالت بھی وہی ہو چکی ہے جو ممفورڈ (MUMFORD) نے اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں امریکی قوم کے بارے میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے ...... وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ..... یہ مہذب وحشی "حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں ..... یہ لوگ کھاتے ہیں پیتے ہیں شادی کرتے ہیں بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی بھی اگر جوا گر کامیاب ہے تو حیوانی نشاط انگیزی کی اور اگر ناکام ہے تو حسد خوف اور پریشانی کی حیوانی سطح اور حیوانی تسکین کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان حیوانی حظ انگیزیوں سے محروم کر دیں تو ان کے لئے جینا محال ہو جائے گا۔ جب کام میں لگے ہیں تو نیم مردہ اور کام سے فارغ ہیں تو نیم زندہ۔ یہ ہے ان کی زندگی کا مآل ہر شہر میں اس قسم کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں ..... جن کے سامنے نہ انسانی معیار ہوتے ہیں نہ انسانی مقاصد۔"

معزز سامعین! ظاہر ہے کہ جب انسان کے سامنے کوئی متعین منزل اور مقصد نہ ہو تو لفظ "ترقی" بھی بے معنی ہو جاتا ہے جب تک پہلے منزل کا تعین نہ کیا جائے سمت بھی متعین نہیں ہو سکتی۔ لہذا جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا زمانہ ترقی یافتہ زمانہ ہے تو یہ گفتگو یکسر بے معنی ہے جب تک پہلے یہ نہ طے کیا جائے کہ وہ نصب العین ہے کیا جس کی طرف ہمارا زمانہ ارتقا پذیر ہے! اور سائنس چونکہ نصب العین نہیں متعین کر سکتی اس لئے سائنٹیفک ایجادات کو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ اسی وجہ سے عصر حاضر کے انحطاط کی وجہ بقول پروفیسر جوڈ ترک مقصد یعنی — DROPPING OF OBJECT ہے۔ اس لئے کہ ہم خود انسانی زندگی اور اس کے مقصد کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکے۔ اسی وجہ سے جب صورت یہ ہو کہ آدمی کے پاس بے پناہ قوتیں تو آجائیں لیکن اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ خود کیا ہے اور اس کی زندگی کا منتہی کیا ہے تو وہ قوتیں سوائے تخریب کے کس کام آئیں گی۔ جب انسانی بستی میں ہزاروں لاکھوں حیوان اکٹھے رہتے ہوں جن کے پاس لامحدود قوتیں ہوں جن پر فطرت نے کوئی پابندی عائد نہیں کی ہو تو سوچئے اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔ جناب صدر! اگرچہ انسانی تاریخ خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کی ایک داستان مسلسل ہے۔ لیکن جس قسم کی ہولناک تباہیاں اس صدی میں رونما ہوئی ہیں اس کی مثال پہلے کہیں نہیں ملتی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی مقام انسانیت کی طرف بلند ہونے کے بجائے حیوانیت کی پستی کی طرف گرتا جا رہا ہے۔ عالمگیر تباہیوں نے جس بری طرح نوع انسانی کو گھیر رکھا ہے اس کی بنیادی وجہ حیوانی نظریہ زندگی ہے اور اگرچہ مذہب پرست طبقہ زبانی اس نظریہ کی مخالفت کرتا رہتا ہے لیکن اصل میں وہ بھی اسی نظریہ کے تابع ہے۔ اس کی وجہ اختصاص چند مذہبی رسوم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی؎

شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
یہ الگ بات ہے ہم ان کا ادب کرتے ہیں

ایک طرف تو یورپ کے مفکرین اپنی تہذیب کے بھیانک نتائج سے اس درجہ ہراساں اور پریشان ہو چکے ہیں کہ کسی دوسری تہذیب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ دوسری طرف امت مسلمہ نے اسلاف پرستی، تقلیدی روش اور تقدیر کے عقیدہ پر

تکیہ کر کے صدیوں سے غور و فکر سے کام لینا چھوڑ رکھا ہے جیوانوں کی طرح اس پر بھی جمود کی کیفیت طاری ہے کیونکہ حیوان بھی بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار وارادہ اپنے اسلاف کے مسلک پر قائم رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب کوئی قوم اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کے نزدیک "سمع، بصر اور قلب" سے کام لینے کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جہنمی ہیں۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ عقل و فکر سے کام لئے بغیر اندھوں کی قطار میں چلنے والے انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ اتبعوا ما انزل اللہ یعنی قرآن کی پیروی کرو تو کہتے ہیں ہم تو اسی مسلک و مذہب کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسلاف کا یہ احترام ان کے دل میں اس درجہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے تو اس سے انہیں اسی طرح غصہ آجاتا ہے جیسے کسی نے ان کے باپ کو گالی دی ہو یا ان کے معبود کی شان میں گستاخی کی ہو اور بعض اوقات تو دنگا فساد کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس وقت مجھے چند سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ جب چند قلب سلیم رکھنے والے نوجوانوں نے طلوع اسلام کے افکار کو پھیلانے کے لئے لاہور میں اس کے لٹریچر کی تقسیم کا کام شروع کیا۔ ان میں میرے بھائی جان بھی شامل تھے تو ایک دن ایک مقامی درس گاہ میں یہ لوگ چند نوجوانوں سے محو گفتگو تھے تاکہ انہیں قرآن کے مطالعہ کی طرف راغب کر سکیں کہ اچانک چند سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری نوجوانوں نے ایک طرف سے متوجہ ہو کر صرف پرویز صاحب کا نام سن کر ان پر ہلہ بول دیا۔ اور شدید ضربات پہنچائیں۔ انہوں نے یہ سننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ یہ نوجوان آخر کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ تو صرف یہ جانتے تھے کہ یہ ایک ایسے شخص کا نام لے رہے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے ملا سے سنا ہے کہ "وہ کافر ہے"۔ حالانکہ اگر وہ ملا کے قول پر تکیہ کرنے کی بجائے ذرا بھی اپنے ذہن پر زور دے کر بات سنتے تو ان کی رائے یکسر تبدیل ہو سکتی تھی۔

بزرگان گرامی! مذہب غریبوں کو اس عقیدہ میں ہمہ مگن رکھتا ہے کہ امیری، غریبی، عزت، ذلت سب خدا نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ اسے ہر شخص کی پیدائش سے پہلے مقدر کر دیا گیا ہے اور تقدیر کے خلاف صرف شکایت لب پر لانا انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ اس طرح انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہنے دی جاتی۔ اور اس طرح طاقتور کمزور کو ہمیشہ کے لئے اپنا زیر دست بنائے رکھتا ہے۔ اور جب ہم قوم کی حدود سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر جاتے ہیں تو وہاں بھی یہی حالت ہے کہ کمزور قوم طاقت ور یا ترقی یافتہ قوم کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ فساد انسانیت کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ جب آبادیاں وسیع ہو جائیں۔ اور انسان نے بارٹر سسٹم کی بجائے کاروبار میں سہولت کے لئے سکہ ایجاد کیا تو اس کا مفید استعمال کرنے کی بجائے ہوس پرستی اور دوسروں کو مغلوب کرنا شروع کر دیا اور غالب اقوام نے تبادلہ زر کے عیارانہ طریقہ سے سکوں کی قیمت میں اس طرح فرق رکھا کہ پسماندہ اقوام ان کی زیر دست رہیں جس کے اثر سے انسان دوسرے انسان سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یتیما ذا مقربۃ۔ اور بقول جگر مرادآبادی ؎

انساں کے ہوتے ہوئے انساں کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں!

تعمیر کے پردے میں یہ انداز حکومت
تخریب بہ عنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں!

بزرگانِ گرامی! ہماری قوم میں مظلوم ترین طبقہ یعنی عورتیں سب سے زیادہ مذہب کا شکار بنی رہی ہیں۔ مذہب نے تقدیر کے عقیدہ کی بنیاد پر ان کو ہمیشہ سے مردوں کا محکوم اور غلام بنا کے رکھا ہے۔ وہ انہیں مقامِ انسانیت دینے کو تیار نہیں۔ آج ہمارے معاشرہ میں قوم کی ہزاروں بیٹیاں ایسی ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انسانیت کے بلند مقام تک پہنچنا چاہتی ہیں لیکن مذہب کی بنیاد پر تعمیر شدہ معاشرہ ان کو پابند سلاسل اور حیوانیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے یعنی عورت اگر انسان بننا چاہے بھی تو نہیں بن سکتی۔ اور اس محکومیت اور بے جا پابندیوں کی وجہ سے جب لڑکیاں اپنی آرزوؤں اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیتی ہیں تو نتیجہ سامنے ہے کہ معاشرہ میں نفسیاتی مسائل اور نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ (ہسٹریا کا مرض اس "حیوانیت" کی واضح مثال ہے) ستم بالائے ستم یہ کہ مردوں کی محکومیت کا عقیدہ ہمارے معاشرہ کی اکثر خواتین کے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی مرد یعنی اپنے "مجازی خدا" کی رضامندی حاصل کرنا سمجھ لیا ہے اور اس کے لئے ہر وقت جاذبِ توجہ بنے رہنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں اور معلوم نہیں عورت نے یہ کب سے سمجھ رکھا ہے کہ آرائش اور زیبائش اور طرح طرح کے زیورات کے بغیر اسکی ذات کی تکمیل ناممکن ہے۔ حالانکہ یہی زیورات کسی زمانہ میں غلامی کی علامات کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے اور دورِ بادشاہی میں یہ مکروہ رسم تھی کہ ایک عورت کو قربانی کے بکرے کی طرح سجا سنوار کر تماشہ بنا کر رکھ دیا جاتا اور اب تماشہ بننے کی خواہش کی تکمیل میں عورت خود کو مصروف رکھتی ہے اور اس طرح اپنی زندگی کے قیمتی لمحات ضائع کرنا عورت کی نادانی نہیں تو اور کیا ہے ؟ یعنی

تجھ سے گلہ کیا نہ زمانے سے کچھ کہا
برباد ہو گئے ہیں بڑی سادگی سے ہم

ظاہر ہے اگر عورت میں اعلیٰ انسانی صفات کا فقدان ہوگا تو اس کی اولاد بھی انسانیت کے مقام تک نہیں پہنچ سکے گی۔ کیونکہ جس معاشرہ میں غلط قسم کے عقاید، مذہب پرستی اور حیوانیت کا دور دورہ ہو تو اس میں پرورش پانے والے ذہن بھی اسی ماحول کے مطابق تشکیل پائیں گے۔ اور پھر ہمارے تعلیمی نظام کے تمام مقاصد حیوانی سطح کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اچھے ڈاکٹر یا انجینئر پیدا ہو جائیں لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ اچھے انسان بھی بنے ہیں یا نہیں۔ آخر میں، میں اپنے مافی الضمیر کو بابا جی کے گراں قدر الفاظ کے پیرہن میں پیش کرتی ہوں "قانونِ ارتقاء کی رُو سے وہی نوع آگے بڑھ سکتی ہے جس کی مضمر صلاحیتیں اس قدر نشو و نما حاصل کر لیں کہ وہ تخریبی قوتوں کی مدافعت کر سکیں اور انسانی معاشرہ میں یہ استعداد صرف نظامِ ربوبیت سے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ قرآن کا مقصد ایسے ہی نظام کی ترویج اور تنفیذ تھا جو نوعِ انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ اور اسی قوم کے ہاتھ میں انسانیت کا مستقبل ہوگا جو اس نظام کو نافذ کرے گی"۔ اور وہی قوم آدمی کو انسان بنا سکے گی۔

والسلام!

(۱۲)

غلام صابر

ہم سب جس صورت حال میں زندگی گزار رہے ہیں اس کا تذکرہ آنسوؤں اور آہوں کی زبان سے ہی ہو سکتا ہے بے یقینی اور خوف و ہراس کی چڑیلیں ہمارے احساسات پر چھائی ہوئی ہیں۔ ایک طرف اپنے وجود کو بچانے اور دوسری طرف اپنے آپ کو ہی تباہ و برباد کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں۔ مفاد پرستوں کے بے ضمیر گروہ اس صورتِ حال میں بھی نہایت سفاکی اور سنگدلی کے ساتھ اس آگ کو اور زیادہ تیز کرنے میں مصروف ہیں — ہم آج آگ اور زلزلے کی لپیٹ میں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بے یقینی اور خوف و ہراس کی آگ پہلے ہمارے وجود کو جھلسے گی اور پھر ہمارا نیم مردہ وجود زمین کا نوالہ بن جائے گا — ہم فکر و نظر اور دیدہ دانش کے اعتبار سے پستیوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ اس آئینہ میں غالب کا یہ شعر ایک سچائی کے طور پر قبول کرنا پڑتا ہے کہ

بسکہ دشوار ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

صاحب صدر! یہ ایک چیخ ہے، ایک آہ ہے — اور تلخ حقائق پر آنسوؤں کی لب کشائی ہے۔ ظالمانہ نظام کے معاشرتی جبر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ایسی تصویر جس پہ تخلیقی جوہروں کے خون کے دھبے ہیں۔ اور ان دھبوں کا وجود شکست کے اندوہناک احساس اور عزم کی ہمت آفرینی کے بین بین صورت حال سے ترتیب پاتا ہے۔

صاحب صدر! اس میں شبہ نہیں کہ جذبات ہی کی دو مختلف کیفیتوں کو ہم غم اور خوشی کا نام دے دیتے ہیں اور ہمارے جذبات و احساسات ہماری مادی صورتِ حال ہی کا حقیقی عکس ہوتے ہیں لیکن اس حقیقی عکس سے متعلق انسانی رویوں میں رنگا رنگی کا ہونا بھی ایک بڑی سچائی ہے۔ مثلاً غم ہماری زندگیوں کی ایک بڑی سچائی ہے — لیکن اس غم کے بارے میں ہمارے رویے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد بھی ہوتے ہیں۔ انہی رویوں کو اگر معیار بنایا جائے تو آدمی اور انسان کے انتہائی لطیف فرق کو حیطۂ ادراک میں لایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی دراصل غم ہے، یعنی دکھوں کا گھر اور مصائب و تکالیف کا گہوارہ — اور یہ دکھ کی فضا ایک مقدر ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا — لہٰذا زندگی کے بارے میں پہلا رویہ شکست کے اعتراف اور غم کی پرستش کرنے کا رویہ ہے۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی کی اندوہناک اور دردناک صورتِ حال کو بدلنے اور کسی "حسرتِ تعمیر" کا نام زندگی ہے۔ یعنی دکھوں کو خوشیوں کی پُر بہار وادیوں میں تبدیل کر دینے کا نام — ان دونوں رویوں کے آئینہ میں آدمی اور انسان کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اور پہچان کا معیار ہماری مادی صورتِ حال ہی ہو سکتی ہے

صاحب صدر! کسی بھی معاشرے کی مادی صورت حال کا مطلب وہاں کے خاندانی نظام، گھریلو ماحول، بچوں کی تربیت کا نظام، تعلیمی نظام، عقاید — سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی ماحول کی کیفیت کا نام ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بچے کی پیدائش سے لیکر یونیورسٹی کی تعلیم تک وہ کون سی تعمیری طریقِ کار اور ماحول میسر ہے جو اُسے آدمی سے انسان بنانے کے لئے مؤثر ثابت ہو۔ اس مشاہدہ کے لئے کسی افلاطون کی ضرورت نہیں — کیا یہ حقیقت نہیں کہ بیمار اور بدبودار فضاؤں میں پیدا ہو کر سسکیوں اور آہوں، ابہام اور بے یقینی —

مفاد پرستی اور خود غرضی، بے مقصدی اور لاپرواہی، بے غیرتی اور بزدلی کے طویل سلسلے کا نام — پاکستانی نظامِ تعلیم و تربیت ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر آدمی کو انسان ہونا کیسے میسر آسکتا ہے۔

صاحب صدر! ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم و تربیت کا اگر کوئی وجود ہے تو اس کی بنیاد بے مقصدیت کے عناصر اور مفاد پرستی کے خمیر پر تربیت پاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مستقبل ایک تباہ کن انجام کا خوفناک مقام ہے۔ ہم نے چند برس ہوئے آزادی حاصل کی تھی۔ آزادی ایک بڑی نعمت ہے کہ اس میں آدمی کی مضمر صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ جیسے کہ پھولوں کی وادی میں صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خوشبو کو فضا میں پھیلانے کا موجب بنتی ہے۔ اور قریب سے گزرنے والے بھی راحت و فرحت کا دولت اٹھاتے ہیں اور زندگی راحتوں اور خوشیوں کی دلہن نظر آتی ہے۔ لیکن اگر یہ ہوا آندھی اور تیز ہو کر پھولوں کی پتیوں کو بکھیرنا شروع کر دے۔ تو فضا میں جو تکدر پیدا ہوگا، وہ حیطۂ احساس میں لایا جا سکتا ہے۔ یعنی آزادی نرم خرام نسیم صبح کا نام ہے جو خوشبوؤں کو فضا میں پھیلاتی اور بے قرار دلوں کو راحت و مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اور غلامی اس بھیانک منظر نامے کا نام ہے جس میں پھولوں کی پتیاں انتشار و اضطراب کی گرد اب میں بکھر جائیں۔ چونکہ پھولوں کی پتیوں کے مناسب اور متناسب ترتیب کا نام ہی پھول ہے اور یہ پتیاں جب بکھر جاتی ہیں تو پھر نہ پھول کا وجود رہتا ہے اور نہ ہی وہ دلربا و دلکش منظر۔ ہر معاشرے کا محنت کش طبقہ ہی دراصل پھولوں کی پتیوں کی مانند ہوتا ہے۔ یعنی پھولوں کے پودوں کا وجود اُن کے خونِ جگر کا محسوس پیکر ہوتا ہے۔ جو معاشرہ 'محنت' ہی کو عزت اور تکریم کا معیار قرار دیتا ہے، وہ معاشرہ ہی اس کے زندگی بخش ثمرات سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ فائدہ اُس معاشرے کی تعلیم گاہوں کی خوشبو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر حسنِ ذوق اور سچے اخلاص کی دولت فراواں ہو جایا کرتی ہے۔

دوستو! ہمارے ملک میں عزت و احترام کا معیار کیا ہے۔ محنت یا سرمایہ! حقیقت یہ ہے کہ اس دیس میں عزت و افتخار کا معیار محنت نہیں بلکہ سرمایہ ہے۔ اسی لیے آدمی کو انسان میسر ہونے کی بھی اُمید نہیں۔ ظلم اور دھاندلی جس معاشرہ کی بنیاد ہو، اُس میں 'محنت' کے خونِ جگر کی خوشبو کی تلاش پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔

آپ میں سے اکثر جانتے ہوں گے کہ محنت کشوں کے بیٹے اپنی جوانیوں کو ان کارخانوں اور فیکٹریوں میں لیکر جاتے ہیں، ساری زندگی دن اور رات کی خوفناک گردش میں گذارتے ہیں۔ اور بھری ٹی۔ بی کا جان لیوا مرض لے کر مر جاتے ہیں۔ اُن کی ساری زندگی کی محنت کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی جوان بیٹیاں بے سہارا و لاچار اپنے باپ کی میت پر آنسو بھی نہیں بہا سکتیں۔ کہ آنسو بھی تو زندگی کی نشانی ہوتے ہیں۔

ان محنت کش لوگوں کی جوان بیٹیوں کے پھٹے ہوئے کپڑوں، افسردہ چہروں اور بے چارگی کے لمحوں کی روشنی میں غالب کا یہ مصرعہ سمجھ میں آتا ہے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

صاحب صدر! جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کسی بھی معاشرے کے چمنستان کی خوشبو، وہاں کی تعلیم گاہ اور وہاں کے باشندے ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک خاکروب سے لے کر بڑے سربراہ تک کا وجود ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی آزادی کے دن سے لے کر آج تک نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے کن مقاصد کو سامنے رکھا۔ اور کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھے یہ سوال ہی

بجائے خود ایک بھرپور طنز سا محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال فطرت کے قوانین سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ انہیں کسی کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر تقاضے سے عدل کرتا جانتے ہیں۔

آپ کو ہر طرف سے یہ آواز سنائی دیتی ہوگی کہ نظامِ تعلیم تبدیل ہونا چاہیئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے یہاں "اسلامی نظام" نافذ ہونا چاہیئے۔ نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے لئے کن اصولوں کو بنیاد بنانا ہوگا تو اس کے لئے وہ نہایت آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ 'اسلام' کو بنیاد بنا کر نظامِ تعلیم بدلا جائے۔ اُن سے ذرا آرام سے یہ پوچھا جائے کہ بھائی صاحب! اسلام کے وہ کون اصول ہیں جنہیں نظامِ تعلیم کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اور پھر آپ کے نزدیک 'اسلام' کیا ہے ۔۔۔ ! اس کا جواب کھوکھلی تقریر یا بے معنی غم و غصہ کی شکل میں ملتا ہے۔ ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کا ایک خاص حصہ گزار لیا ہے۔ اور ہماری بے عملی (بلکہ بداعمالیوں کی) فہرست بھی طویل شکل اختیار کر گئی ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نظامِ تعلیم تبدیل ہونا چاہیئے تو وہ اعمال کی لمبی فہرست بہرحال ضرور منصۂ شہود پر آئے گی۔ اس لئے آج یہ کہنا پڑتا ہے کہ "نظامِ تعلیم تبدیل ہونا چاہیئے تھا" اور یہ تبدیلی پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ہونی چاہیئے تھی"۔ چونکہ ہم نے ایسا نہیں کیا، (اپنی مفاد پرستیوں کی وجہ سے سرمایہ ہی کو انسانی معاشرہ کی حقیقی بنیاد سمجھ لیا۔ اس لئے آج اس کے شدید اثرات سے ہم کسی طور نہیں بچ سکتے۔ ہماری منزلیں اتنی ہی دور ہو گئی ہیں اور ہماری مشکلات اُتنی ہی شدید تر ہو گئی ہیں جس قدر ہم نے تغافل برتا ہے۔ ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کا ایک طویل عرصہ ضائع کیا ہے، اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان درس گاہوں سے ایک کھیپ، ایک نسل، ایک عظیم گروہ اور ایک قوم ہماری درسگاہوں سے تیار ہو کر باہر آ چکی ہے۔ جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے تہذیب کا ایک لمحہ ضائع کر دیا۔ اور تہذیب ذہنی، جذباتی، ارادی و شعوری رویوں کے تعین کرنے کا ہی نام ہے۔ کسی معطل اور منجمد لفظی پیکر کا نام نہیں۔

آج اگر ہم میں سے ہی تعلیم یافتہ لوگ یہ کہیں کہ:

(۱) مملکتِ پاکستان کا وجود ہی غلط بنیادوں پر قائم ہے۔

(۲) قرآن اور اسلام مفاد پرستوں کے کھوکھلے نعرے ہیں۔

(۳) نظریہ ایک ڈھکوسلا ہے جس سے انسانوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اصل حقیقت لذت اور مسرت ہے یہی زندگی ہے۔

تو یہ اس ذہنیت کا اظہار ہے جس کے لئے ہم نے اپنے ملک میں شعوری یا غیر شعوری طور پر پہنچنے کی راہ ہموار کی ہے اس طرح ہم نے 'تعلیم' کو جو آدمی کو انسان بنانے کا واحد ذریعہ تھی' اُسے آدم سے بھی نچلی سطح پر گرانے کا ذریعہ بنا ڈالا۔ اور یہ سلسلہ خدا جانے کہاں جا کر رُکے گا۔

صاحبِ صدر! مجھے کہنا یہ ہے کہ ہمارے ملک کی درس گاہوں میں ماحول کے اعتبار سے اور نصاب کی روشنی میں جس اجتماعی نفسیاتی شخصیت کی تعمیر کی جاتی ہے وہ کسی طور بھی آزادانہ سوچ اور فکر کی حامل نہیں بلکہ غلامانہ ہے ۔ تعلیمی ماحول میں ہمارے تخلیقی جوہروں اور مضمر صلاحیتوں کی اُن کے اصل کے اعتبار سے نشوونما نہیں کی جاتی بلکہ ہم پڑھ لکھ کر ایک مرعوب اور احساسِ کمتری کے لفظی بت بن جاتے ہیں ۔۔۔ ایسے بت جو اپنی ظاہری چمک دمک اور کتابی مالاؤں پر ہی قانع ہو رہتے ہیں۔